علامہ انور شاہ کشمیری

تالیف

مولانا عبد القیوم حقانی

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ
براہ پوسٹ آفس خالق آباد ضلع نوشہرہ

تذکرہ وسوانح برائے تبصرہ وتعارف

علامہ انور شاہ کشمیریؒ

مولانا عبدالقیوم حقانی

سلسلۂ نسب' ولادت' تحصیل وتکمیلِ علم' تذکرۃ الاساتذہ' تدریسی عظمت و خصوصیات' بے مثال علمی تبحر' حیرت انگیز مطالعاتی یادداشتیں' طالبانِ علومِ نبوت پر شفقت وتربیت' بے تکلفی وظرافت' محدثانہ مباحث کے نادر نمونے' ذوقِ شعروادب' افادات کے شہ پارے' حسنِ سیرت کا مرقع' اتباعِ سنت' خودداری اور استغناء' سلوک وتصوف' عبدیت وانابت' عشقِ رسول ﷺ اور قادیانیت کا تعاقب اور دو تاریخی دستاویزات کا تذکرہ ....

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ سرحد پاکستان

فون نمبر 0923-630237 ——— فیکس 0923-630094

نام کتاب -------- تذکرہ وسوانح علامہ انور شاہ کشمیریؒ
تالیف -------- مولانا عبدالقیوم حقانی
کمپوزنگ -------- جان محمد جان رکن القاسم اکیڈمی
ضخامت -------- 298 صفحات
تعداد -------- 1000
تاریخ طباعت -------- رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ / اکتوبر 2006ء
ناشر -------- القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ
برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ، سرحد، پاکستان

ملنے کے پتے

☆ صدیقی ٹرسٹ، صدیقی ہاؤس المنظر اپارٹمنٹس 458 گارڈن ایسٹ، نزد لسبیلہ چوک کراچی

☆ مولانا سید محمد حقانی، مدرس جامعہ ابوہریرہ خالق آباد ضلع نوشہرہ

☆ کتب خانہ رشیدیہ، مدینہ کلاتھ مارکیٹ، راجہ بازار، راولپنڈی

☆ مکتبہ سید احمد شہید، ۱۰ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

☆ مکتبہ بخاری صابری مسجد گلستان کالونی مرزا آدم خان روڈ ملیاری کراچی

☆ مولانا خلیل الرحمٰن راشدی صاحب، جامعہ ابوہریرہ چنتوں موم ضلع سیالکوٹ

اس کے علاوہ اکوڑہ خٹک اور پشاور کے ہر کتب خانہ میں یہ کتاب دستیاب ہے

شورش کاشمیریؒ

کا

منظوم خراجِ عقیدت

غاشیہ بردار دربار رسول اللہ ﷺ کا
ماضیِ مرحوم کے اعجاز دکھلاتا رہا
آدمی کے رُوپ میں قدرت کا روشن معجزہ
علم کی ہیبت سے رزم و بزم پر چھاتا رہا
سادگی میں عہدِ اوّلی کے صحابہ ؓ کی مثال
سیرتِ پیغمبرِ کونین ﷺ سمجھاتا رہا
یہ جہاں فانی ہے کوئی چیز لافانی نہیں !
پھر بھی اس دنیا میں انور شاہؒ کا ثانی نہیں

فہرستِ ابواب

باب : ۷

رخ انور کی تابانیاں حسن صورت وسیرت کا مرقع،
دلبرانہ ادائیں معصومیت اتباع سنت کا اہتمام
خودداری واستغنا اور مخلوق خدا پر شفقت

باب : ۸

سلوک وتصوف اور صفائے باطن کا اہتمام احترام واطاعت اساتذہ،
حضرت گنگوہیؒ سے عشق ومحبت، عبدیت وانابت،
معاصی سے اجتناب اور نفرت

باب : ۹

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قادیانیت کا تعاقب

باب : ۱۰

حضرت امام کشمیریؒ کا سفر آخرت

باب : ۱۱

دو تاریخی دستاویزات

۱۔ مقدمہ بہاولپور کی تفصیلی رپورٹ

۲۔ علامہ رشید رضا کی آمد پر علماء دیوبند کے عقائد، مسلک ومنہج پر مفصل خطاب

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فہرست مضامین

سوانح حضرت علامہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ

عنوان	صفحہ
اہتمام احترام و اطاعت اساتذہ، حضرت گنگوہیؒ سے عشق و محبت، عبدیت و انابت، معاصی سے اجتناب اور نفرت	
حضرت گنگوہیؒ سے بیعت و خلافت	۱۷۸
باطنی کیفیت کی جھلک	۱۷۸
مسئلہ احسان	۱۷۹
علم غالب اور سلوک مغلوب تھا	۱۸۰
احسانی کیفیت شریعت و سنت اور استقامت	۱۸۱
حضرت صوفی بھی ہیں	۱۸۲
شاہ صاحب کو دیکھ کر خدا یاد آجاتا ہے	۱۸۳
حضرت گنگوہیؒ کے عاشق زار	۱۸۳
اپنے استاذ پر پنکھا جھلاتے رہے	۱۸۴
حضرت شیخ الہندؒ کا احترام	۱۸۵
سراپا انکسار خادم	۱۸۵
سارا نشہ ختم ہو گیا	۱۸۶
شاہ کے یکہ کے پیچھے دوڑتے رہے	۱۸۷
کتاب کا احترام	۱۸۷
مطالعہ کے لئے وضو کا اہتمام	۱۸۸
کہ غیر محرم عورت پر نظر نہ پڑ جائے	۱۸۸
اتفاقاً غیر محرم پر خاتون پر جب نظر پڑی	۱۸۹
حرام کا ایک پان بھی گوارا نہ ہو سکا	۱۸۹
حفاظت مال کا تعویذ	۱۹۱
کیڑے سے حفاظت کا تعویذ	۱۹۱
فقہاء سبعہ مدینہ	۱۹۲
باب: ۹ — عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قادیانیت کا تعاقب	۱۹۳
ذکر محبوب	۱۹۶
روضہ رسول ﷺ پر حاضری	۱۹۶
سوز دروں و عشق رسول ﷺ	۱۹۶
قادیانیت کا ارتداد اور کفر کا سیلاب اُمڈتا چلا آرہا ہے	۱۹۷
ہدیۃ المہدیین کی طباعت	۱۹۷
قادیان میں اعلان حق اور رد مرزائیت	۱۹۸
شاہ صاحب کو قتل کی دھمکیاں	۱۹۸
تردید مرزائیت میں تصانیف کا سلسلہ	۱۹۹
فتنہ قادیانیت کے استیصال کیلئے عملی کام	۲۰۰
مسئلہ رفع و حیات عیسیٰ علیہ السلام	۲۰۱
ختم نبوت پر مستقل کتاب	۲۰۲
مولانا مرتضیٰ حسن کی تصانیف	۲۰۳
تاریخی مناظرہ	۲۰۳
شاہ صاحب کو مناظرے کی اطلاع	۲۰۴
ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں	۲۰۵
قادیانی رسوا ہو گئے	۲۰۶
حضرت شاہ صاحب کا دورۂ پنجاب	۲۰۶

عنوان	صفحہ
بہاولپور کا معرکۃ الآراء تاریخی مقدمہ	۲۰۷
بیماری کے باوجود بہاولپور کا سفر	۲۰۸
ختم نبوت کا مقدمہ لڑنے کیلئے سفر حج ملتوی کر دیا	۲۰۹
کمرۂ عدالت یا دیوبند کا دار الحدیث	۲۱۰
امام کشمیریؒ عدالت کے کمرے میں	۲۱۲
مقدمے کا بصیرت افروز فیصلہ	۲۱۳
امام کشمیریؒ کی کرامت	۲۱۳
فیصلہ میری قبر پر سنایا جائے	۲۱۵
غلام احمد قادیانی کو جہنم میں جلتا ہوا دکھاؤں	۲۱۶
امام کشمیریؒ کے ایک خادم کا اعلان	۲۱۷
فتنہ مرزائیت پر شاہ صاحب کی تصانیف	۲۱۸
عقیدۃ الاسلام فی نزول عیسیٰؑ	۲۱۹
خاتمۃ التصانیف	۲۱۹
امام کشمیریؒ کا عربی قصیدہ	۲۲۰
تحفظ ختم نبوۃ کا کام نہ کر سکے تو کل کا کتا بھی بہتر ہے	۲۲۲
فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کیلئے تلامذہ کو وصیت	۲۲۳
فتنہ قادیانیت کا مقابلہ کرو	۲۲۳
آخری وصیت	۲۲۳
میں جنت کا ضامن ہوں	۲۲۶
امام کشمیریؒ نے عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت کا اعزاز بخشا	۲۲۷
قائد شریعت	۲۲۹
امیر شریعتؒ سے محبت اور تعلق پر افتخار	۲۲۹
علامہ اقبالؒ سے تعلق و دوستی	۲۳۱
انور شاہ کی مثال یا ارشاد علامہ اقبالؒ	۲۳۱
قادیانی نبوت برگ حشیش	۲۳۳
علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ اقبالؒ	۲۳۳
علامہ اقبالؒ کو امام کشمیریؒ کا تحفہ	۲۳۴
اے دل! اتمام نفع ہے سودائے عشق میں	۲۳۶
باب: ۱۰ — حضرت امام کشمیریؒ کا سفر آخرت	۲۳۷
حضرت امام کشمیریؒ کی علالت	۲۴۰
شفیق باپ کی شفقت کا آخری مظاہرہ	۲۴۱
چوں قضا آید طبیب ابلہ شود	۲۴۱
علم و کمال کا آفتاب غروب ہوا چاہتا تھا	۲۴۲
سفید پوشوں کا مقدس ہجوم	۲۴۳
کائنات علم کا عظیم سانحہ	۲۴۳
امام المحدثین کی وفات ہو گئی	۲۴۴
غسل کی تیاری	۲۴۵
جنازہ میں جم غفیر	۲۴۵
دلدوز اور بھیانک منظر	۲۴۶
میاں اصغر حسین نے نماز جنازہ پڑھائی	۲۴۶
بھائی ہمیں یہیں دفن کرو	۲۴۸
طویل القامہ جسیم و شیم سفید پوش	۲۴۸

مقدمہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

*

حضرت الاستاذ الاکبر علامہ سید محمد انورشاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی مبارک ہستی نہ کسی تعارف کی محتاج ہے نہ کسی تاریخ کی دست نگر، ان کی حقیقی تاریخ ایک جیروں چلتی تاریخ ہے جو ان کے تلامذہ اور مآثر علمی کی صورت میں ہمہ وقت دائر وسائر نمایاں اور چشم دید رہتی ہے۔ اس اُمت مرحومہ میں لاکھوں علماء وفضلاء پیدا ہوئے اور اپنے نورانی آثار دنیا کے لئے چھوڑ گئے، لیکن ایسی ہستیاں معدودے چند ہیں، جن کا فیض عالمگیر اور محبوبیت عام قلوب کی امانت ہو اور جن کے علم کے ساتھ ساتھ عمل سے بھی اُمت نے استفادہ کیا ہو۔ حضرت امام العصر علامہ انورشاہ صاحبؒ کی ہستی انہیں مبارک اور معدودے چند ہستیوں میں سے ایک ممتاز ہستی ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور صدیوں کو علم وفضل سے رنگین کر جاتی ہیں۔ حضرتؒ کا علم اگر متقدمین کی یاد تازہ کرتا تھا تو ان کا عمل سلف صالحین کو زندہ کئے ہوئے تھا اور اسوۂ سلف کے لئے نمونہ ساز تھا۔

علم حافظہ تقویٰ وطہارت اور زہد وقناعت مثالی تھی۔ علمی حیثیت سے ہم تلامذہ انہیں چلتا پھرتا کتب خانہ کہا کرتے تھے اور عملی حیثیت جو ہمہ جہت اتباع سنت کے نور میں ڈھلا ہوا تھا، اکثر وبیشتر ان کے عمل ہی سے مسائل معلوم کر لیتے تھے اور مسئلہ وہی نکلتا جو ان

کا عکس ہوتا تھا۔ ان کے روشن چہرہ پر ایمان کی چمک اس طرح نمایاں تھی کہ غیر مسلم بھی دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ اگر اسلام مجسم صورت میں آتا تو وہ علامہ انور شاہ کی صورت میں ہوتا۔ ہمارے شیخ و مربی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ :

"ہمارے زمانے میں مولانا انور شاہ صاحبؒ کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے"۔

آج سے ستر اسی سال قبل جبکہ حضرت الاستاذ قبلہ شاہ صاحبؒ جوان عمر تھے، مظفر نگر کے ایک جلسۂ مناظرہ میں جو مسلمانوں اور آریوں کے درمیان ہوا تھا، حضرت علامہ مرحوم بھی دارالعلوم دیوبند کی طرف سے اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے ساتھ شرکت جلسہ کے لئے تشریف لے گئے اور اسٹیج پر تشریف فرما تھے تو آریہ مبلغ نے کھلے لفظوں میں کہا تھا کہ اگر کسی کی صورت دیکھ کر اسلام قبول کیا جاتا تو آج بھی مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی صورت دیکھ کر مسلمان ہو جانا چاہئے تھا، جن کے چہرے پر ہی اسلام برستا ہوا دکھائی دیتا ہے، درس حدیث کے لئے جب حضرت شاہ صاحبؒ اپنے قیام کے کمرے سے درسگاہ کی طرف چلتے ہوئے نظر آتے تو ہم لوگوں میں ایک دوسرے کو آمد کی اطلاع دینے کے لئے بے ساختہ جو کلمہ زبان زد تھا وہ یہ تھا کہ "جاء الشیخ الثقۃ الامین" جو درحقیقت ان کے ظاہری و باطنی کمالات کی وجہ سے خود بخود قلوب میں راسخ ہو گیا تھا۔ درس میں اس وقار سے بیٹھتے جیسے کوئی پُر رعب و ہیبت بادشاہ اپنی رعایا کے سامنے تخت نشین ہو۔ کلام نہایت باعظمت، متین اور علمی مواد سے لبریز ہوتا اور نقل و روایۃ کی قسم سے جو بھی دعویٰ فرماتے، اسی وقت کتب متعلقہ کھول کر اس کی عبارت سامنے کر دیتے۔ کتب حدیث کا ڈھیر خصوصیت سے سامنے رکھا ہوا ہوتا تھا۔ درس میں تبحر اور تفقہ دونوں یکساں چلتے تھے۔ درس حدیث فقط فن حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ جمیع علوم وفنون کے حقائق

پر مشتمل تھا۔ میں خود حضرتؒ کی تقریر قلمبند کرتا تھا۔ اپنی کاپی کی طوالت عنوانات سے بچانے کے لئے تقریباً سات کالموں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ہر کالم پر عنوانات کے عنوان دیئے ہوئے تھے، جیسے فن صرف و نحو، فن معانی و بلاغت، فن تفسیر و حدیث، فن فقہ و اصول فقہ، فن منطق و فلسفہ اور فن ہیئت اور فن تاریخ وغیرہ کیونکہ اہم مسائل میں ان فنون کے مسائل تقریباً ہر روز آتے تھے جو مسئلہ جس فن کا ہوتا کہ میں اسی کالم میں اس کا اندراج کر لیتا اور درس سے اٹھ کر یہ معلوم ہوتا کہ ہم لوگ صرف حدیث ہی پڑھ کر نہیں آئے ہیں، بلکہ جمیع فنون متداولہ کا درس لے کر آ رہے ہیں ....

لیس علی اللّٰہ بمستنکر   ان یجمع العالم فی واحد

روئیداد دارالعلوم میں حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"حضرت شاہ صاحبؒ کشمیر کے ایک ممتاز علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار مولانا سید معظم شاہ صاحب ایک جید عالم دین اور عارف کامل تھے۔ حضرت شاہ صاحب بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور بے مثل قوت حافظہ کے مالک تھے۔ آپ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء میں دیوبند تشریف لائے۔ حضرت شیخ الہندؒ مسند صدارت پر متمکن تھے۔ استاذ نے شاگرد کو اور شاگرد نے استاد کو پہلی ہی ملاقات میں پہچان لیا۔ تفسیر و حدیث کی کتابیں شروع کیں اور چند ہی سال میں دارالعلوم میں شہرت و مقبولیت کے ساتھ ایک امتیازی شان حاصل کر لی۔ ۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر آپ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سند حدیث کے علاوہ باطنی فیض سے بھی مستفیض ہوئے اور خلافت حاصل کی۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ نے مدرسہ امینیہ دہلی میں فرائض تدریس انجام دیئے، پھر حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور ۱۳۲۷ھ سے دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگے اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے خصوصی مہمان کی حیثیت سے رہے۔

۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء کے اواخر میں جب حضرت شیخ الہندؒ نے سفر حجاز کا قصد کیا تو اپنی جانشینی کا فخر حضرت شاہ صاحبؒ کو بخشا۔ دارالعلوم کی مسند صدارت حدیث پر تقریباً ۱۲ سال تک آپ جلوہ افروز رہے۔ ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء کے اوائل میں اہتمام دارالعلوم سے بعض اختلافات کے باعث آپ فرائض صدارت سے دست کش ہو کر جنوبی ہند کے مدرسہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تشریف لے گئے اور ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء تک وہاں درس حدیث کا مشغلہ جاری رہا۔ قدرت کی جانب سے آپ کو حافظہ ایسا عدیم النظیر بخشا گیا تھا۔ ایک مرتبہ دیکھی ہوئی کتاب کے مضامین و مطالب تو درکنار عبارتیں تک مع صفحات و سطور کے یاد رہتیں اور دوران تقریر میں بے تکلف حوالے دیتے چلے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ جو علوم کے خزانے ان کے دامن جستجو کی وسعتوں کو مطمئن اور تشنگی علم کو سیراب نہ کر سکتے تھے، کثرت مطالعہ اور قوت حافظہ کے باعث گویا ایک متحرک و متکلم کتب خانہ تھے۔

صحاح ستہ کے علاوہ حدیث کی اکثر کتابیں تقریباً بر نوک زبان تھیں۔ تحقیق طلب مسائل میں جن کی جستجو اور تحقیق میں عمریں گزر جاتی ہیں، مسائل کے استفسار پر چند لمحوں میں اس قدر جامعیت کے ساتھ جواب دیتے تھے کہ اس موضوع پر سائل کو نہ تو شبہ باقی رہتا تھا اور نہ کتاب دیکھنے کی ضرورت، پھر مزید لطف یہ کہ کتابوں کے ناموں کے ساتھ صفحات و سطور تک کا حوالہ بھی بتلا دیا جاتا تھا۔ وہ ہر ایک علم و فن پر اسی طرح برجستگی کے ساتھ تقریر فرماتے تھے کہ گویا ان کو یہ تمام علوم مستحضر ہیں اور ابھی ابھی ان کا مطالعہ کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی ذوق کا طبیعت پر اس قدر غلبہ تھا کہ عرصے تک نکاح اور متاہلانہ زندگی سے گھبراتے رہے، مگر بالآخر بزرگوں کے شدید اصرار سے ۴۳ سال کی عمر میں متاہلانہ زندگی اختیار فرمائی تھی اور اس کے بعد تنخواہ لینے لگے تھے۔ ڈابھیل چند سال

قیام فرمانے کے بعد آخر میں امراض کی شدت سے مجبور ہو کر دیوبند جس کو آپ نے اپنا وطن اقامت بنا لیا تھا، چلے آئے اور یہیں ۳ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء کو تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ مزار مبارک عیدگاہ دیوبند کے قریب ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے دور صدارت تدریس میں ہزار سے زائد طلبا کو درس حدیث پڑھایا جن میں ممتاز تلامذہ کے اسماء گرامی یہ ہیں:

حضرت مولانا مفتی شفیع دیوبندیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، مولانا شبیر علی تھانویؒ، مولانا عبدالرحمان کامل پوریؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا محمد انوریؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ، مولانا سیدؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا محمد میاں دیوبندیؒ اور مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانویؒ وغیرہ۔

مختصر یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ تمام علوم معقولات و منقولات میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور قوت حافظہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ کئی مشہور محققانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا درس حدیث اپنے دور کا مشہور درس تھا جو ایک خاص امتیازی طرز لئے ہوئے تھا۔ آپ کے تبحر علمی نے درس حدیث کو جامع علوم و فنون بنا دیا تھا اور آپ کے درس نے نقل و روایت کی راہ سے آنے والے فتنوں کے لئے آنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ آج بھی نمایاں اور ممتاز علماء اور صاحب طرز فضلاء زیادہ تر آپ ہی کے تلامذہ ہیں جو ہند و پاک میں علمی مسندوں کو آراستہ کئے ہوئے ہیں۔ آپ کے یہاں رد قادیانیت کا خاص اہتمام تھا اور اس فتنہ کو اعظم الفتن شمار کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں کئی معرکۃ الآراء کتابیں خود بھی تصنیف

فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں۔ اس بارے میں بڑے شغف کے ساتھ لکھنے والوں کو علمی مدد دیتے تھے۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور حضرت مولانا سید بدرِ عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنیؒ نے خصوصیت سے حضرت شاہ صاحبؒ کی ردِ قادیانیت تحریک میں عملی حصہ لیا اور تحریر وتقریر کے ذریعے اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے سرگرمی سے کام کرتے رہے۔

الغرض حضرت شاہ صاحبؒ کی آخری زندگی تردید قادیانیت میں صرف ہوئی اور انہیں کامل شغف اس فتنہ کبریٰ کے استیصال سے رہا، جس سے حضرت شاہ صاحب مرحوم کا بغض فی اللہ نمایاں ہوجاتا ہے، جو محبت حضرت خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ کا ایک واضح نشان اور ورثۃ انبیاء کی کھلی دلیل ہے۔

حضرتؒ کے اس سلسلہ کے مضامین ومقالات جن کا تعلق تردید قادیانیت سے ہے، خصوصاً مقدمہ بہاولپور میں انہوں نے کئی روز مسلسل ردّ قادیانیت اور قادیانیوں کے کفر کے اثبات میں جو نہایت پُرمغز اور علمی بیانات کے اہم اقتباسات حضرت شاہ صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا سید انظر شاہ صاحب نے اپنی تالیف "نقشِ دوام" میں جمع کردیئے ہیں (جنہیں پیش نظر کتاب میں بھی نقل کردیا گیا ہے) جن سے قادیانیت کے متعلق اکابرِ دارالعلوم دیوبند کا نقطۂ نظر مدلل طور پر سامنے آگیا ہے اور ساتھ ہی متعلقہ علوم اور اُصول و مقاصد دین بھی واشگاف ہوگئے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حرفِ آغاز

الحمد لحضرة الجلالة والصلوٰة والسلام علیٰ خاتم الرسالة.

القاسم اکیڈمی اور خود مجھ ناکارہ کی خوش بختی ہے کہ ربّ ذوالجلال نے اکابرؒ کی سوانحات کی اشاعت کی توفیق بخشی۔ سوانح شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ، سوانح قائد ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ، سوانح مجاہد ملت حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، سوانح مولانا محمد احمدؒ اور سوانح مولانا محمد یوسف بنوریؒ (جمالِ یوسف) سوانح شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بعد فخر المحدثین حضرت الامام مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی تابناک زندگی کا یادگار مرقّع اور ہماری تاریخ کا سنہری ورق اس وقت قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ فنِ سوانح نگاری دوسرے فنون کی طرح آج کل بہت ترقی اور عروج پر ہے اور اہل قلم جو اس فن میں مرتبۂ اختصاص رکھتے ہیں، اس کے نوک پلک خاصے درست کرچکے ہیں۔ یہ فن جس قدر مقبول اور قابلِ قدر ہے اس قدر نازک بھی ہے۔ مسلمان سوانح نگاروں نے ہمیشہ صاحبِ سوانح کے سبق آموز اور کردار ساز مواد کو جمع کرکے قوم کے سامنے پیش کیا ہے، جبکہ یورپ کے سوانح نگاروں نے حقیقت نگاری کے نام سے ہمیشہ صاحبِ سوانح کی کردار کشی اور بدنما نمونے پیش کرنے کی روایت ڈالی ہے۔

قارئین کی اکثریت ان شخصیتوں سے جن کے حالات، واقعات مطالعہ میں لانا چاہتی ہے، بذاتِ خود متعارف نہیں ہوتی بلکہ اس کے مرتبہ یقین کا زیادہ تر اعتماد سوانح نگار

کی سوانح نگاری پر ہوتا ہے۔ وہ ان ہی رنگوں سے متاثر ہوتی ہے جو وقائع نگار کے قلم سے ان کی زندگی کے نقشوں میں بھر دیے جاتے ہیں۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ صاحب سوانح کی زندگی کے روشن پہلو سامنے لائے جائیں تاکہ لوگ ان کی سیرت و کردار، اخلاص وللٰہیت، عشق رسول و اتباع سنت، ذوق عبادت و انابت اور بنی نوع انسان سے محبت کی روشنی سے استفادہ کر کے اپنی زندگیوں میں بھی ان اوصاف حمیدہ کے چراغ روشن کر سکیں۔

حضرت الامام مولانا محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ہماری تاریخ کے ایسے ہی روشن چراغ تھے جو اپنے علم و عمل، اخلاق و کردار، خدا پرستی اور خدمت خلق کے حوالے سے انسانیت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ حضرت امام کشمیریؒ وہ شخصیت تھے کہ جن کے علم کے ساتھ ساتھ عمل سے بھی اُمت نے استفادہ کیا۔ حضرت امام کشمیریؒ کی عظمتوں کے بے شمار گوشے ہیں، لیکن مجھ گناہگار نے ان کی سوانح نگاری اس معنی میں نہیں کی کہ ان کی پوری زندگی کے سارے گوشے بیان کرنا مقصود ہو بلکہ ہمارا ہدف تو ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ اکابر و اسلاف کے کردار کی تابناکی کو درخشاں اور نمایاں کرنا چاہئے اور آج بھی ہمارا مقصد یہی ہے۔

پیش نظر سوانح میں بھی آپ کو حضرت امام کشمیریؒ کی زندگی کے اُجلے اور روشن نقوش نظر آئیں گے۔ بارگاہ رب ذوالجلال میں دعا ہے کہ اے باراِلٰہ ! ہمیں حضرت امام کشمیریؒ کی فکر، اعمال، کردار اور ان کے مشن کو اُجاگر کرنے کی توفیق عطا فرما، ہمارے دلوں میں صاحب سوانح کی پیروی اور نقش قدم پر چلنے کا عزم، اشتیاق اور ہمت پیدا فرما، ہمیں اپنی کمزوریوں کا احساس اور عمل نافع کا شوق عطا فرمایا۔

عبدالقیوم حقانی

صدر القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ

شعبان ۱۴۲۶ھ / ستمبر 2006ء

باب : ۱

سلسلۂ نسب، والدین، ولادت، تحصیل علم، تعلیم و تربیت، تذکرۃ الاساتذہ، دارالعلوم دیوبند میں کسب فیض اور تدریسی آغازِ کار

سلسلہ نسب :

فخر المحدثین محدث کبیر حضرت مولانا محمد انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ خاندانی سید تھے۔آپ کے آباء واجداد تقریباً ڈھائی سو سال قبل بغداد سے ہجرت کر کے ملتان سے ہوتے ہوئے کشمیر آ کر آباد ہوئے۔آپ کا پورا سلسلہ اولیاء اللہ اور کاملین سے سرفراز ہے۔خصوصاً شاہ فتح اللہ اور شاہ مسعود نروری کے مزارات آج بھی کشمیر میں مرجع خاص وعام ہیں۔حضرت شاہ صاحبؒ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔حضرت شاہ صاحبؒ نے خود اپنی بعض تصانیف میں اپنا سلسلہ نسب یوں تحریر فرمایا ہے:

محمد انورشاہ بن محمد معظم شاہ بن عبدالکبیر بن عبدالخالق بن پیر اکبر بن پیر حیدر بن عارف باللہ بن بابا علی بن شیخ عبداللہ بن شیخ مسعود کشمیری۔

والدین :

حضرت شاہ صاحبؒ کے والد حضرت مولانا محمد معظم شاہ بڑے متبحر عالم دین تھے۔سہروردیہ سلسلہ میں مجاز طریقت تھے۔ہزاروں کشمیریوں نے ان کے دست حق پرست پر بیعت کی،ایک سو پندرہ سال کی طویل عمر پائی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی والدہ محترمہ بھی سیدہ تھیں۔گویا آپ طرفین سے سید النسل تھے۔بعض علماء کرام نے لکھا ہے کہ اگر ننھیال سادات سے ہو تو اس کی جانب

انتساب کرتے ہوئے خود کو سید بھی لکھنا جائز ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ کا نام "بی بی مال دیدی" تھا۔ کشمیری زبان میں "مال" کے معنی پہاڑ کی اونچی چوٹی ہے اور دیدی کا لفظ کشمیری زبان میں عزت واحترام کا مفہوم ادا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ گویا "مال دیدی" کا مفہوم ہے پہاڑ کی اونچی چوٹی کی طرح بلند رتبہ خاتون۔ آپ کی والدہ محترمہ پیر سیف اللہ شاہ کی دختر تھیں، چند پشتیں اوپر جا کر آپ کی والدہ کا سلسلہ نسب بھی حضرت شیخ مسعود شاہ کشمیریؒ سے جا ملتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی والدہ محترمہ بچپن ہی سے صوم وصلوٰۃ کی پابند اور قرآن مجید کی تلاوت کی رسیا تھیں۔

وطن اور ولادت :

حضرت شاہ صاحبؒ کی ولادت ۲۷ رشوال المکرم ۱۲۹۲ھ بوقت صبح بروز شنبہ موضع دودھوان لولاب علاقہ کشمیر میں ہوئی۔ دودھوان دراصل دُو دون ہے اور کشمیری زبان میں اس کا مطلب ہے دودھ سے بھرپور جنگل۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس گاؤں کے شمال مشرق کی طرف نہایت سرسبز چراگاہ تھی، جس میں گائیں بھینسیں اور بکریاں وغیرہ چر کر خوب دودھ دیتی تھیں۔ اس لئے مقامی لوگوں نے اس چراگاہ کو دودون کا نام دیا اور بعد ازاں پورا گاؤں دودھوان کے نام سے مشہور ہوا۔

اے وادی لولاب :

مشہور شاعر حفیظ جالندھریؒ نے ایک علاقہ کی منظر کشی اپنے شاعرانہ انداز میں یوں بیان کی ہے جو حرف بحرف دودھوان کے منظر کی عکاسی کرتی ہے ....

دور انسان کی نگاہ سے دور　　دور دنیا کی شاہراہ سے دور
ایک وادی ہے کوہساروں میں　　حسن کی فطرتی بہاروں میں

نغمہ زن آبشار چاروں طرف　　ندیاں بے شمار چاروں طرف
پھوٹتے ہیں ہزارہا چشمے　　سرد و شفاف و خوش نما چشمے
لپٹ گئی ہے زمین پھولوں سے　　بن گئی ہے نازنین پھولوں سے

علامہ محمد اقبالؒ فرمایا کرتے ....

اے وادی لولاب!　　پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب

سراپا :

مولانا حامد الانصاری غازی آپ کا سراپا تحریر فرماتے ہیں :

علامہ انور شاہ کشمیری! جسم نور کی چادر میں لپٹا ہوا، چہرہ مہتابی، چودھویں رات کا چاند، رنگ خوب کھلا ہوا گورا، چاندنی کی چاندنی میں دھلا ہوا، بزرگوں سے سنا جوانی میں سیب کی طرح سرخ تھے ادھیڑ عمر میں رنگ ہلکا سنہرا زعفرانی تھا، بڑھاپے میں سپیدی پر زردی سی چھائی رہتی تھی، وصال سے پہلے زردی ہی زردی تھی۔

پیشانی شاہی مسجد دہلی کی محراب کی طرح وسیع اور بلند تھی۔ آنکھیں معصوم اور کسی قدر معصوم، نہ بڑی نہ چھوٹی، اکثر اوقات رکوع میں رہتیں، جب قیام کے لئے اٹھتیں تو نور یقین کی چمک سے چاندنی سی پھیل جاتی، جب درس میں روایت حدیث کے ساتھ درایت کارفرما ہوتی اور محسوس ہوتا کہ آپ مقام اجتہاد سے بہت قریب ہیں تو آواز میں بلندی اور نگاہوں میں تیزی پیدا ہو جاتی اور شاگرد اس کی تپش اپنے سینوں میں محسوس کرتے۔ خاص طور پر اس وقت جب مذاہب اربعہ کے بیان کے بعد امام ابن تیمیہ سے مخاطب ہوتے اور مسلک جمہور کو ترجیح دیتے، سننے والے چند منٹ میں کئی مقامات طے کر لیتے۔ اہل علم خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ سننے والوں کا کیا عالم ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب کبھی آسمان کی طرف دیکھتے اور کبھی شاگردوں کی طرف خاص شان سے فرماتے کہ:

"میں امام بخاریؒ کے قدموں میں بیٹھ کر بات کرتا ہوں اور امام ابن تیمیہؒ سے سر اٹھا کر بات کرتا ہوں"۔

اس جملہ کو کئی پہلو سے ادا کرتے اور ہم لوگ ہونٹوں کے اتار چڑھاؤ سے انداز کرتے کہ آج بات میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہے۔

حضرتؒ کے ہونٹ گداز تھے، خاموشی میں محبوبیت کی شان تھی۔ بولنے میں محبوبیت کی یہ شان اور دوبالا ہو جاتی۔ جب بات میں ابلاغ کی شان ہوتی تو شاگردوں کو پیار سے "جاہلین" کہہ کر خطاب کرتے، مگر کسی فرد کو کبھی جاہل نہ کہتے۔ قابل اور ذی استعداد طلبہ کو "صاحب سواد" کہتے، قابل اور صاحب سواد طلبہ یہ تھے۔ ادریس کاندھلوی بدر عالم میرٹھی، محمد صدیق نجیب آبادی، مناظر احسن گیلانی، محمد یوسف شاہ، میر واعظ کشمیری، محمد شفیع دیوبند، ابوالوفا شاہجہاں پوری، محمد طیب قاسمی، عتیق الرحمٰن عثمانی، سید میرک شاہ کشمیری، لطف اللہ پشاوری، احمد اشرف راندیری، فصیح الدین بہاری، انوار الحسن شیر کوٹی، سید محمد یوسف بنوری اور سعید احمد اکبر آبادی، زین العابدین میرٹھی اور حبیب الرحمٰن مکی۔

ہر دورۂ حدیث کے صاحب سواد طلبہ الگ ہوتے، میرا حال سب سے الگ تھا: صاحب سواد تھا نہ جاہلین میں سے! ہمیشہ نظر خاص سے فیضیاب رہا۔ دل ہی دل میں اکثر حضرت الاستاذ سے مخاطب ہوتا اور کہتا

یہ مانا تیرا حسن ہے لاجواب — مری عاشقی بھی کوئی چیز ہے

آپ بھولے نہ ہوں گے میں سراپا لکھ رہا ہوں، بات چہرے سے ہونٹوں تک اور حسن سے حسن کلام تک پہنچی۔ اب آواز پر آیئے۔

آواز میں ترنم تھا اور ترنم میں گرگاہٹ تھی جس سے آہنگ میں دلکشی کے ساتھ شان امتیاز پیدا ہو جاتی اور آواز اپنی عالمانہ خصوصیات کے ساتھ الگ پہچانی جاتی۔ شعر پڑھتے تو آواز کی بلندیوں اور وادیوں سے گذرتی کی موڑتی اور آخر میں نون غنہ لہراتا اور سننے والوں کو اس لب ولہجہ پر بے اختیار پیار آتا۔

اب قد وقامت کا تصور فرمایئے۔ قد سرو تھا نہ صنوبر نہ بڑا نہ چھوٹا بلکہ کھنچتا ہوا درمیانہ، تن بدن نہ اکہرا نہ دوہرا بلکہ موزوں اور متناسب، سراپا میں عظمت ووقار، روحانیت کا حسن اور شخصیت کا جلال، چلتے تو راستہ بن جاتا نظر اٹھتی تو ہجوم کے دو ٹکڑے ہو جاتے اور صراط مستقیم تیار ہو جاتی اور حضرت استاد اپنے خاص شاگردوں کے ساتھ گذر جاتے۔

چال بہت ہی ہلکی قدم بہت نرم نرم اور بے حد نازک اتنے نرم کہ چیونٹی قدموں کے نیچے آ جائے تو درود پڑھتی ہوئی اپنی راہ چلی جائے۔ جب چلتے تو نظریں نیچی رہتیں، کبھی کبھی نظر اٹھا کر سامنے دیکھتے۔ راستے میں بات کرنے اور ادھر اُدھر دیکھنے کی عادت نہ تھی۔ چلتے ہوئے نظر کے ساتھ کمر ہلکی جھکی رہتی، اس طرح قدم اٹھاتے جیسے پستی سے بلندی کی طرف جا رہے ہوں۔ درسگاہ سے قیام گاہ یا مسجد جاتے دونوں طرف شاگردوں کا صحیح معنی میں عاشقوں کا ہجوم، دل چاہتا حضرت الاستاذ ہمارے سامنے سے گذرتے رہیں اور ہم عمر بھر دیکھتے رہیں۔

لباس! تن زیب ایسا کہ اب تک دیکھا نہ سنا سر سے پاؤں تک سبز حلہ، سر پر سبز رومال، بدن پر سبز رنگ کا چوغا، قدموں کو چومتا ہوا ایسا معلوم ہوتا کہ جنت کے سبزہ زار سے کوئی فرشتہ زمین پر اتر آیا۔ لباس کا سبز رنگ گہرا نہ تھا بلکہ کھلتا ہوا، تصوف کے سات رنگ مشہور ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ساتوں رنگ ایک ذات اور ایک رنگ میں سمٹ آئے ہیں جیسے کشمیر کی ساری بہار ایک سراپا میں تحلیل ہو گئی ہے۔ سچ یہ ہے کہ کشمیر کی طرح آپ بھی

جنت نظیر تھے۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہوں نے علامہ انور شاہ کو دیکھا۔ ان سے فیض پایا، ان سے درس حدیث حاصل کیا، ان کے فیضان علم سے علم و تحقیق کو جلا دی۔ ان کی صحبت سے مستفید ہوئے اور ان کی مشعل علم سے روشنی حاصل کر کے دنیا کی سرحدوں تک، ڈاکر سے لے کر قازان روس اور سائبیریا تک علوم و فنون کا نور لے کر پہنچے حق یہ ہے کہ جن اہل علم اور اصحاب کمال کو اس عجوبہ عالم شخصیت سے تعلق رہا، انہیں ہفت عجائبات عالم کو دیکھنے کی نہ فرصت ملی نہ کبھی تمنا ہوئی۔ (ماہنامہ دارالعلوم نمبر ۱۹۸ از مولانا حامد انصاری غازی)

ابتدائی تعلیم :

حضرت شاہ صاحبؒ نے تقریباً پانچ سال کی عمر میں اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد معظم شاہ سے قرآن پاک پڑھنا شروع کیا اور چھ سال کی عمر تک ناظرہ قرآن مجید ختم کرنے کے علاوہ فارسی کی ابتدائی کتب نام حق کریما، پند نامہ، شیخ عطار، دستور الصبیان وغیرہ اور عربی زبان کی منیۃ المصلی اور قدوری وغیرہ پڑھ لیں۔ اللہ نے آپ کو ذکاوت و ذہانت کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا۔ آپ بچپن ہی سے بہت زیادہ ذہین، فطین، لائق اور ذی استعداد طالب علم تھے۔

والد کا اعتراف و شہادت :

آپ کے والد محترم حضرت مولانا معظم شاہ صاحب راوی ہیں کہ:

"جب میرے بیٹے محمد انور شاہ نے مجھ سے مختصر القدوری پڑھنا شروع کی تو مجھ سے بعض ایسے مسائل دریافت کرتے کہ میرے لئے مبسوط کتابوں کا مطالعہ کئے بغیر ان کا تسلی بخش جواب دینا ناممکن ہوتا، جو کچھ ایک بار پڑھ لیتے، وہ حافظہ میں پتھر کی لکیر بن

جاتا۔ میں انہیں علمی باریکیوں اور کتابی موشگافیوں سے بچنے کی تاکید کرتا لیکن کتاب کی صرف عبادت کے مفہوم تک خود کو محدود رکھ کر چلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ حضرت شاہ صاحب کی اس ذہانت و فطانت سے پریشان ہو کر میں نے انہیں ایک دوسرے عالم کے سپرد کیا، مگر دوسرے استاد کو بھی ان سے یہی شکایت پیش آئی۔

اپنے وقت کا رازی و غزالی بنے گا :

حضرت شاہ صاحبؒ بچپن میں ایک دفعہ منطق اور نحو کے چند رسائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اتفاقاً ایک بڑے عالم اس وقت آپ کے پاس آ گئے اور آپ کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھا، کتابوں پر خود شاہ صاحبؒ کے حواشی لکھے ہوئے تھے، بچپن کے زمانہ کی اس ذکاوت و ذہانت کو دیکھ کر اس عالم نے بے اختیار کہا کہ یہ بچہ اپنے وقت کا رازی اور اپنے زمانے کا غزالی ہوگا۔

عظیم الشان عالم بنے گا :

آپ کے والد حضرت مولانا معظم شاہ صاحبؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ اور آپ کے بڑے بھائی یاسین شاہ مرحوم کو کشمیر کے پہاڑوں میں اعتکاف کرنے والے ایک عارف کامل کے پاس حصول برکت کے لئے لے گئے۔ اس عارف نے جب حضرت شاہ صاحبؒ کو دیکھا تو آپ کے والد سے پوچھا کیا یہ تمہارا بچہ ہے؟ پھر خود ہی کہنے لگے کہ یہ بڑا عظیم الشان عالم بنے گا اور مستقبل میں اس کی علمی عظمت مسلم ہوگی۔

لوگ مہدی موعود ہونے کا شبہ کرتے :

حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک موقع پر فرمایا: میرے غیر معمولی احوال دیکھ کر کشمیر

کے عوام شبہ کرتے تھے کہ میں ہی مہدی موعود ہوں۔ میرے والد محترم اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کو عوام کی اس غلط فہمی کی تردید کرنی پڑتی تھی۔ فرمایا کرتے، میں بارہ سال کی عمر میں فتوے دینے لگا تھا اور نو سال کی عمر میں فقہ و نحو کی مطولات کا مطالعہ کر چکا تھا۔

(حیات انور ص ۲۰۴)

ہزارہ میں آمد :

جب حضرت شاہ صاحبؒ کی عمر چودہ (۱۴) سال کی ہوئی تو آپ ہزارہ (سرحد) کے متعدد علماء کی بارگاہ علم میں حاضر ہوئے اور علوم عربیہ کی تکمیل فرماتے رہے۔ تین سال ہزارہ میں رہے۔ جب دارالعلوم دیوبند کی علمی عظمتوں کا تذکرہ سنا تو مزید علوم کے حصول کا شوق اس قدر بڑھا کہ ہزارہ سے دیوبند آ گئے۔ اس وقت آپ کی عمر سترہ سال تھی۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ :

۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ یہاں چار سال رہ کر تعلیم کی تکمیل کی اور ۲۰ سال کی عمر میں دورۂ حدیث مکمل کیا۔ دیوبند سے سند حدیث حاصل کرنے کے بعد آپ گنگوہ تشریف لے گئے اور حضرت مولانا مفتی رشید احمد گنگوہیؒ سے سند حدیث حاصل فرمائی اور ظاہری و باطنی علوم کی تکمیل کے بعد سلوک و طریقت کے مدارج طے فرمائے اور حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہو کر شرف خلافت سے مشرف ہوئے۔

تذکرۃ الاساتذہ :

دارالعلوم دیوبند میں جن اکابر اساتذہ سے آپ کو شرف تلمذ حاصل رہا ہے، ان کا تذکرہ اور حضرت شاہ صاحبؒ کی طالب علمی کی داستان نذر قارئین ہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ :

حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ جب آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، اس وقت آپ قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے۔ علم حدیث کی تحصیل حضرت نانوتویؒ سے فرمائی اور حضرت نانوتویؒ کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل کی۔ حضرت نانوتویؒ حضرت شیخ الہندؒ پر خصوصی شفقت فرماتے تھے، چنانچہ ان کی اعلیٰ علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے پیش نظر دارالعلوم دیوبند کی مدرسی کے لئے اکابر کی نظر انتخاب آپ پر پڑی۔ ۱۲۹۱ھ میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۳۰۸ھ میں صدر مدرس کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ ۱۲۹۱ھ میں اتر پردیش کے گورنر سر جان نے اپنے ایک معتمد جان پامر کو اس غرض سے دارالعلوم دیوبند بھیجا کہ وہ خفیہ تحقیق کرکے رپورٹ پیش کرے کہ دارالعلوم کا مقصد کیا ہے؟ جان پامر نے اپنے مشاہدات و تاثرات کا بڑے دلچسپ انداز میں اظہار کیا ہے۔

جان پامر بارگاہ شیخ الہندؒ میں :

جان پامر لکھتا ہے۔ میں دارالعلوم دیوبند پہنچا۔ جہاں ایک نوجوان (حضرت شیخ الہندؒ) بیٹھا ہوا تھا۔ ایک موٹی کتاب اس کے سامنے رکھی ہوئی تھی اور دس بارہ طالب علم پڑھ رہے تھے۔ ایک طرف دو بندوقیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے سلام کیا، اس نے کمال اخلاق سے جواب دیا۔ میں نے پوچھا گذشتہ سال آپ نے دستار فضیلت باندھی ہے۔ کہنے لگے اساتذہ کی عنایت ہے۔ میں نے پوچھا یہ بندوقیں کیسی ہیں؟ کہنے لگے مجھے شکار کا شوق ہے۔ سات سے دس بجے تک پڑھاتا ہوں اور پڑھتا ہوں گیارہ سے ایک بجے تک شکار اور دو سے چار بجے تک ترجمہ کرتا ہوں۔ میں نے دریافت کیا آپ نوکری کیوں نہیں

مدرس ہو گئے۔ آپ کو تمام علوم متداولہ میں مہارت تامہ حاصل تھی، لیکن حدیث سے بہت زیادہ شغف تھا۔ اسی شغف کے سبب آپ نے ابوداؤد کی شرح بذل المجہود کے نام سے لکھی جو پانچ جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی کئی تصانیف موجود ہیں۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفۂ اجل تھے۔ ایک دفعہ حضرت گنگوہیؒ نے مولانا خلیل احمدؒ کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں بھیجا اور حضرت حاجی صاحبؒ کو لکھا کہ مولوی خلیل احمد حاضر خدمت ہو رہے ہیں، آپ ان کی باطنی حالت پر مطلع ہو کر مسرور ہوں گے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے جب آپ کی باطنی حالت دیکھی تو بہت خوش ہوئے اور اپنے سر سے دستار اُتار کر آپ کے سر پر رکھ دی اور اپنی جانب سے تحریری خلافت عطا فرمائی۔ بعد میں اس اجازت نامہ پر حضرت گنگوہیؒ نے دستخط فرمائے۔ (تاریخ دارالعلوم نمبر ۱۸۷)

حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزارویؒ :

حضرت مولانا غلام رسول صاحب ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ ۱۳۰۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی۔ ۱۳۰۸ھ میں آپ کو دارالعلوم میں مدرس مقرر کیا گیا۔ علوم عقلیہ ونقلیہ کے حافظ اور جامع تھے۔ طبقہ علماء میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ طلبا بڑے شوق سے ان کے درس میں شامل ہوتے تھے۔
حضرت مولانا انظر شاہ صاحب نقش دوام ص ۳۲ پر رقمطراز ہیں:

"سردی کے زمانے میں مرزئی، اس پر فرغل، اس پر چادر اور پھر لحاف کا بوجھ کھینچ کر درسگاہ میں داخل ہوتے آتے ہی لیٹ جاتے اور فرماتے ارے! کوئی ہے جو مجھے دابے۔ طلبہ جسم دبانے کی سعادت حاصل

کرتے اور سبق شروع ہوتا"۔

انور شاہ کو آتا ہی کیا ہے ؟

آپ کے زمانۂ تدریس ہی میں آپ کے نامور شاگرد حضرت مولانا محمد انور شاہ دارالعلوم کے صدر مدرس ہو چکے تھے اور ان کے علوم کا بحر مواج تلاطم پذیر تھا۔ مولانا مفتی محمود صاحب نانوتویؒ سابق رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند صاحبزادہ ہونے کی بنا پر کہنے سننے میں جری تھے۔ کبھی کبھار عرض کرتے کہ:

"جب آپ سے پڑھایا نہیں جاتا تو مفت میں دارالعلوم سے مشاہرہ کیوں لے رہے ہیں؟ وہ دیکھئے آپ کے شاگرد حضرت شاہ صاحب کس شان کا درس دے رہے ہیں"۔

اس طنزیہ جملہ پر یہ سادہ دل پٹھان زائد کپڑے اُتار کر پھینک دیتا، سنبھلتے ہوئے ارشاد ہوتا: "تو پھر میں کہوں گا کہ انور شاہ کو آتا ہی کیا ہے"؟

کریلا اور نیم چڑھا :

طلبہ کہتے آپ عربی میں تقریر نہیں کر سکتے۔ شاہ صاحب تو عربی میں تقریر کر لیتے ہیں تو فوراً مرحوم کی عربی میں تقریر شروع ہو جاتی، پھر سوال ہوتا اچھا آپ فارسی میں تقریر نہیں کر سکتے جبکہ آپ کے شاگرد فارسی میں تقریر کرنے پر قادر ہیں۔ اس پر فارسی میں تقریر ہوتی۔ فرماتے ہیں کئی زبانوں کا ماہر ہوں، ان زبانوں کی فہرست میں اردو بھی داخل ہے۔ مولانا مفتی محمودؒ مذکور نے عرض کیا اگر آپ اردو جانتے ہیں تو کریلا اور نیم چڑھا کا مطلب بتائیے؟ کچھ وقت کیلئے غوطہ زن ہوئے، پھر ارشاد فرمایا، حرف عطف نے کام خراب کر دیا ورنہ بات صاف تھی کریلا نیم پر چڑھ گیا۔ اس سادگی اور معصومیت سے طلبہ بھی خوب لطف لیتے اور خود ارباب مدرسہ بھی۔

کرتے؟ کہنے لگے خدا تعالیٰ گھر بیٹھے بٹھائے ڈھائی سو روپے مہینہ دیتا ہے، پھر کس لئے نوکری کروں۔

حضرت شیخ الہندؒ کے فیض تعلیم نے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ، مولانا اعزاز علیؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسے مشاہیر علماء کی جماعت تیار کی۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند نمبر ۱۸۷)

انظر شاہ مسعودی کا شہ پارہ :

حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی نقش دوام ص ۲۸ پر فخر المحدثین حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کی حضرت شیخ الہندؒ کی بارگاہ علم میں پہنچنے کی داستان یوں نقل کرتے ہیں:

میرے والد گرامی حضرت شاہ صاحب ۱۳۰۷ھ میں دیوبند تشریف فرما ہوئے تو مدرسہ کے جائے وقوع اور ذمہ داران مدرسہ سے ناواقفیت کی بنا پر دارالعلوم سے قریب شہر کی مشہور مسجد قاضی میں فروکش ہوئے۔ غربت و ناداری کی بنا پر کئی وقت مسلسل فاقہ رہا، لیکن اس فقر و فاقہ کا کسی سے تذکرہ بھی نہیں کیا۔ اس زمانہ میں مسجد کے متولی قاضی احمد حسین تھے۔ قاضی صاحب موصوف نے اس ہونہار طالب علم کے چہرے پر آثار نجابت و شرافت کے ساتھ شدید گرسنگی کا نمایاں اثر دیکھا تو دریافت کیا میاں تم کس ارادے سے دیوبند آئے ہو؟

عرض کیا کہ حضرت مولانا محمود حسنؒ سے حدیث پڑھنے کے لئے کشمیر سے آیا ہوں متولی صاحب نے پہلے کھانا کھلایا، پھر اس نو وارد کو لے کر شیخ الہندؒ کی خدمت میں پہنچے۔ اس وقت دارالعلوم میں نہ مطبخ تھا اور نہ دارالاقامہ میں طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مطابق

گنجائش۔ چنانچہ آپ پٹھان پورہ کی جامع مسجد میں مقیم ہو گئے اور مدتوں اس مسجد کی امامت کے ساتھ ساتھ حمام میں پانی بھرنے، مسجد کی صفائی، صفیں بچھانے اور اٹھانے کا کام انجام دیتے رہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ سے صحیح امام بخاری، سنن ابی داود، جامع ترمذی اور ہدایہ اخیرین پڑھیں۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ گنگوہ تشریف لے گئے جہاں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے حدیث کے علاوہ باطنی تعلیم بھی حاصل کی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ :

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اسی صدف کے اعلیٰ در یتیم تھے جس سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے اعلیٰ شخصیات نکلے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ نے اپنے وجود باسعود کی بدولت مدرسہ دیوبند کو اعلیٰ ترقی پر پہنچایا تھا۔ حضرت گنگوہیؒ اُن قدیم طرز کے علماء میں سے تھے جن کا حلقہ درس ملازمت و وظائف سے بے نیاز تھا۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی خانقاہ میں قیام رہتا تھا۔ تزکیہ قلب اور تزکیہ نفس کے حلقے کے ساتھ ساتھ طلبہ کا مجمع بھی موجود رہتا تھا۔ علم حدیث سے خاص طور پر غیر معمولی شغف تھا۔ تقریر نہایت جامع اور مختصر ہوتی تھی۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل علماء میں جن حضرات نے حضرت گنگوہیؒ کے درس میں شریک ہو کر استفادہ کیا، ان میں حضرت علامہ کشمیریؒ جیسے یگانہ روزگار علماء شامل ہیں۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۸۷)

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ :

حضرت مولانا خلیل احمد حضرت مولانا مملوک علی کے نواسے اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے بھانجے تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مظاہر العلوم سہارنپور میں

بستر باندھ کر اجمیر روانہ ہونے لگے :

مولانا معین الدین اجمیری صدر جمعیت علمائے ہند دیوبند تشریف لائے تو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے تمام اساتذہ کو مطلع کیا کہ اسباق جاری رکھیں۔ مولانا اجمیری گشت کریں گے۔ خدا جانے مرحوم کو یہ اطلاع پہنچی یا نہیں اپنی درسگاہ کو مقفل کر کے چلے گئے۔ ادھر مولانا معین الدین اجمیر روانہ ہو گئے، چائے کی مجلس میں مولانا عثمانیؒ نے مزاحاً فرمایا کہ مولانا اجمیری فرماتے تھے کہ آپ کے شیخ المنطق کو میرے سامنے پڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی، اس پر مولانا غلام رسول صاحب بستر باندھ کر اجمیر روانہ ہونے لگے کہ وہیں مولانا اجمیری کو سبق سنا کر آؤں گا۔ غرض یہ کہ مولانا مرحوم لطائف کی پوٹلی تھے۔

موت کی نشانی :

حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے ایک بار فرمایا کہ عید الاضحیٰ کی تعطیلات تھیں اور میں اپنے کمرے میں حاشیہ نویسی میں مصروف تھا۔ اچانک مولانا غلام رسول صاحبؒ تشریف لائے اور کھڑے کھڑے فرمایا: اعزاز علی! اگر میں مرگیا تو کتنا مجھ کو ایصالِ ثواب کرو گے۔ کچھ عرض معروض کے بعد جیب سے ایک تحریر نکالی، جس پر اپنے تمام تلامذہ سے ایصالِ ثواب کا وعدہ دستخطوں کے ساتھ لے رکھا تھا۔ میں نے بھی ایصالِ ثواب کی مقدار متعین کر کے دستخط کر دیے، پھر پوچھا کہ حضرت! یہ آج آپ نے کیسی مہم شروع کی ہے؟ فرمایا کہ میری شہریوں سے آویزش رہتی، مولوی حبیب ہمیشہ میرا ساتھ دیتا لیکن اس بار کی لڑائی میں حبیب نے میری حمایت ترک کی۔ یہ میری موت کی علامت ہے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد یہ کہنہ سال، سادہ لوح عالم، ہزارہ کا انسان اور استاذ

الاساتذہ ہمیشہ کے لئے گورستانِ قاسمی میں پیوند خاک ہو گیا۔ ۱۳۳۲ھ ۱۸/ محرم الحرام کو آپ خالق حقیقی سے جا ملے۔ حضرت شیخ الہند نے مرحوم کی رحلت پر جو مرثیہ لکھا اس کے ایک شعر میں ان کی علمی اور روحانی زندگی کا خلاصہ آ گیا۔ شعر یہ ہے

گزاری یونہی مرحبا عمر ساری
کہ دن مدرسہ میں تو مسجد میں شب بھر

دار العلوم دیوبند کا قیام آغازِ کار اور شرکاءِ درس :

فخر المحدثین محدث کبیر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ جس وقت دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اُس وقت آپ کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبہ بھی اکتسابِ علم کر رہے تھے۔ جن میں ابوحنیفۂ ہند مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ، امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، حضرت مولانا امین الدین صاحبؒ بانی مدرسہ جامعہ امینیہ دہلی اور حضرت مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری کا نام نامی نمایاں نظر آتا ہے۔

قیام دار العلوم کا زمانہ بڑی بے سروسامانی کا تھا، نہ پڑھانے کیلئے مناسب جگہ تھی اور نہ طلبہ کے رہنے کا کوئی انتظام تھا۔ ابھی دار العلوم کے قیام کا دوسرا سال تھا کہ اچانک دیوبند میں وبائی مرض پھوٹ پڑا، اکثر طلبہ اور اساتذہ اس مرض میں مبتلا ہو گئے اور اپنے اپنے علاقوں کو چلے گئے۔ اس سبب سے دو مہینے تک تعلیم بند رہی، مگر اللہ نے حفاظت فرمائی۔ دار العلوم دیوبند آغازِ کار میں دار العلوم ہونے کے ساتھ ساتھ دار الامتحان بھی تھا۔ دار الاقامہ میں طلباء کے رہنے کے لئے بہت محدود جگہ تھی۔

شہر دیوبند کی مسجد میں قیام :

جن طلباء کے ٹھہرانے کا انتظام دار الاقامہ میں ناممکن ہوتا انہیں دیوبند کے ساتھ

قرب وجوار میں موجود مساجد کے حجروں میں ٹھہرایا جاتا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی ایک عرصہ دراز تک دار العلوم کے دار الاقامہ میں جگہ نہ مل سکی۔ آپ کو اپنے ایک دوسرے ہم سبق ساتھی جن کا نام مولانا مشیت اللہ تھا، کے ساتھ دیوبند کی ایک مسجد میں قیام کرنا پڑا۔ فقر وغربت اور تنگی کے اس دور کے رفیق کی دلچسپ باتیں مولانا انظر شاہ کے قلم سے نذر قارئین ہیں:

رفیق درس بھی اور شاگرد بھی:

مولانا مشیت اللہ بجنور کے ایک رئیس خاندان کے چشم وچراغ، دل کے غنی، پوشاک کے غریب، عمل کے مسلمان، عقیدہ کے مؤمن، معصومیت بھولا پن اور سادگی کے پیکر تھے۔ سینکڑوں بیگھہ زمین کے مالک، بعض گاؤں بھی ان کی ملکیت میں، لیکن معمولی کرتا شرعی پاجامہ، دھوڑی کا جوتہ، سر پر دو پلی ٹوپی، اپنے طرز میں صلابت کا یہ عالم کہ مولوی سلطان الحق ناظم کتب خانہ دار العلوم دیوبند ایک مرتبہ گرگابی پہن کر ان کے یہاں جا پہنچے تو بولے کہ ”اللہ جانے! مولوی صاحب تم میں بھی فرنگیت آ گئی“۔ ”اللہ جانے“ مرحوم کا تکیہ کلام تھا۔ شاہ صاحبؒ کے رفیق درس اور ایسے رفیق کہ اپنی امارت کے باوجود حضرت شاہ صاحب کی غربت کے شریک کار۔ شاہ صاحبؒ پٹھان پورہ کی مسجد میں امامت کرتے تو بجنور کا یہ رئیس زادہ حق رفاقت ادا کرتے ہوئے سقایہ بھرتا، مغرب کے بعد دونوں دار العلوم آتے تو راہ چلتے حضرت شاہ صاحبؒ مولانا مشیت اللہ کو آسمان پر موجود ستاروں کی تشخیص وتعیین ان کے بروج وگردش اور فلکیات کا سبق پڑھاتے۔

طفل نوخیز بڑوں کے کان کتر رہا ہے:

مولانا مشیت اللہ صاحب کو حضرت شاہ صاحبؒ سے عجیب وغریب تعلق تھا۔ زمانہ طالب علمی میں گھر پہنچے تو اپنے ماموں مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب سے شاہ صاحب کا

وقیع تذکرہ کیا اور یہ خوش خبری بھی سنائی کہ وہ میری دعوت پر بجنور آ رہے ہیں۔ حکیم صاحب طبی مشغولیت کے باوجود بڑے علم دوست وعلماء پرور تھے۔ اپنے بھانجے سے آنے والے مہمان کا وسیع تذکرہ سنا تو سراپا اشتیاق بن گئے۔ اسٹیشن پر اپنے خادم کو استقبال کے لئے بھیجا۔ شاہ صاحبؒ اترے تو بے ریش وبروت جوان رعنا، حسن وکشش کا پیکر، خادم نے حکیم صاحب سے جا کر کہا کہ کیسا عالم، کہاں کا عالم وہ تو ایک طفل نوخیز ہے۔ مولوی مشیت اللہ نے اس کے تعارف میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔

جوہر شناس حکیم نے جوہر کو پہچان لیا:

شام کو حضرت شاہ صاحب اور مولوی مشیت اللہ اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔ ایک دن حکیم صاحب تشریف لائے، شاہ صاحبؒ ان کو دیکھ کر سروقد ہو گئے۔ چارپائی پر نشست اس طرح تھی کہ سرہانے حکیم صاحب اور پائنتی پر سبزہ آغاز مہمان، علمی گفتگو شروع ہوئی، جس کا سلسلہ اس وقت کے مشہور عنوان ”امتناع نظیر“ پر جا پہنچا۔ حکیم صاحب اس زمانے میں امتناع نظیر پر کتاب تصنیف کر رہے تھے۔

چند لمحات کی گفتگو کے بعد جوہر شناس حکیم نے شاہ صاحب کو پہچان لیا، بے اختیار کھڑے ہو گئے، ہاتھ پکڑ کر سرہانے بٹھا دیا اور خود سامنے کی چارپائی پر آ گئے، صبح ہوئی تو جس خادم نے حضرت شاہ صاحبؒ کو طفل نوخیز کا عنوان دیا تھا، اس سے فرمایا میاں! جسے تم کمسن کہہ رہے تھے، وہ ہم بڑوں کے کان کتر رہا ہے، پھر اپنی تصنیف پر شاہ صاحبؒ سے تقریظ بھی لکھوائی جو حکیم صاحب کی مطبوعہ تصنیف میں موجود ہے۔ (نقش دوام ص ۳۷)

مولانا امین الدین نے مدرسہ قائم کر دیا:

حضرت مولانا مشیت اللہ صاحب کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کے دوسرے

مخلص اور ہم سبق دوست حضرت مولانا امین الدین صاحب نے تحصیل علم سے فراغت کے بعد یہ قصد کیا کہ دہلی میں علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس کے لئے ایک مثالی مرکز بنانا چاہئے کیونکہ تدریس ہی اشاعت اسلام کی بنیاد اور اساس ہے۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تعلیم و تدریس کی جو اہمیت تھی، اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف لائے تو آپ نے وہاں صحابہ کرامؓ کے دو حلقے دیکھے۔ ایک حلقے میں لوگ تلاوت و دعا میں مشغول تھے اور دوسرے حلقے میں قرآن مجید کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یہ فرما کر محمد عربی ﷺ قرآن مجید کے حلقۂ درس میں تشریف فرما ہو گئے۔ ابتداء اسلام سے لے کر چوتھی صدی ہجری تک دینی تعلیم و تدریس کا کام مساجد سے لیا جاتا رہا۔ اس دور میں مساجد کے پہلو بہ پہلو مدارس و مکاتب کے قیام کا ذوق عام تھا۔ اس زمانے میں ہر علاقے کے صاحب استطاعت لوگ طالبان علوم نبوت پر متوجہ رہتے تھے اور طلبہ کی امداد و اعانت کو باعث سعادت سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا امین الدین صاحب نے حضرت شاہ صاحب کو اپنے ساتھ شامل ہونے اور تعاون کی درخواست کی۔ مولانا امین الدین نے خود مدرسے کے اہتمام و انصرام کا کام سنبھال لیا اور تدریس کی ذمہ داری حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالے کر دی۔

مدرسہ کا سب سے پہلا مال[illegible]:

حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک مشہور و معروف شا[illegible] و اور خادم خاص مولانا ادریس صاحب سکھروڈوی کی روایت ہے کہ خود شاہ صاحبؒ کو اس بات کا اطمینان نہ تھا کہ مولانا امین الدین کی یہ کوشش جس قدر [illegible] ثابت ہوں' واقعی اتنی کامیاب ہو جائے

گی۔ حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے:

جب مولانا امین الدین صاحب مجھے لینے کیلئے بجنور پہنچ گئے تو چونکہ زمانہ قیام دار العلوم میں مولانا امین الدین صاحب بہت اخلاص و محبت سے پیش آتے رہتے تھے، تو یہ خیال کر کے کہ مدرسہ چلے یا نہ چلے۔ مولوی صاحب کی دل شکنی نہ ہو، میں مولوی صاحب کے ساتھ ہو لیا اور دہلی پہنچ کر سولہ یا سترہ روپے جو میرے پاس تھے وہ بھی میں نے مولانا کے حوالے کر دیے۔ یہی روپے مدرسہ کا سب سے پہلا مالی سرمایہ تھا۔

بلا تنخواہ مدرس:

چنانچہ مولانا امین الدین نے اس رقم سے کاغذ لا کر مدرسہ کے لئے رجسٹر بنائے اور طلبہ کو داخل کرنا شروع کر دیا۔ مولانا کا توکل خدا کے فضل سے کامیاب رہا اور کسی انتظار کے بغیر طلبہ کا اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ مسلمانوں نے بھی توجہ کی اور مدرسہ کی مالی حالت قابل اطمینان ہو گئی۔ حضرت شاہ صاحب تین (3) سال تک مدرسہ میں بحیثیت صدر مدرس بلا تنخواہ کام کرتے رہے، جب مدرسہ کی مالی حالت کسی حد تک سدھر گئی تو مدرسین کو حق الخدمت دینا ضروری سمجھا گیا اور حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اقل قلیل بوجہ کفاف قبول کرنا مان لیا جس پر مبلغ 20 روپے آپ کا ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا۔

ڈیڑھ پیسے کی روٹی:

حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ کا بیان ہے کہ میں جن ایام میں حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں مدرسہ امینیہ میں پڑھتا تھا حضرت شاہ صاحب ڈیڑھ پیسے کی روٹی منگا کر کھایا کرتے تھے۔ اس برائے نام خوراک پر سارا دن درس و تدریس اور علوم و فنون کے مطالعہ میں گذرتا تھا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب یوں رقمطراز ہیں:

''علامہ فہامہ جناب مولانا محمد انور شاہ صاحب ساکن کشمیر بے نظیر شخص ہیں، ذہن و ذکاء، ورع و تقویٰ میں مرد کامل، مدرسہ امینیہ میں ابتداءً مدرس تھے۔ اس علم کے شجر کے لگانے والے آپ ہیں۔ کیونکہ مولانا محمد امین صاحب جب دہلی تشریف لائے اور مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت ان کے پاس نہ سامان تھا نہ روپیہ آپ نے محض متوکلاً علی اللہ سنہری مسجد میں پڑھانا شروع کیا۔ اور مولانا محمد انور شاہ صاحب آپ کے شریک تھے۔ دونوں صاحبوں نے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں، فاقے کئے مگر استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آہستہ آہستہ اہل دہلی کو خبر ہوئی اور لوگ متوجہ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مدرسہ امینیہ اس حد تک پہنچا جو آپ کی نظر کے سامنے ہے۔

غرض کہ ابتدائی زمانہ کی کسمپرسی کی حالت میں مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ اس مدرسہ کے اعلیٰ و اول محسن ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کرنا اور ہمیشہ ان کو یاد رکھنا اہل مدرسہ کا فرض ہے۔ مولانا نے ایک عرصہ تک مدرسہ ہذا میں درس دیا اور طلبا کو مستفید فرمایا، پھر والدین سلمہما اللہ تعالیٰ کے تقاضے اور اصرار سے وطن تشریف لے گئے۔ ۱۳۲۵ھ میں حج کو تشریف لے گئے۔ واپسی پر دہلی میں دو ماہ قیام فرمایا اور اب بھی وطن میں تشریف رکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ مولانا کو تادیر سلامت رکھے اور ان کے بے نظیر علمی کمال سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے''۔ (آمین)

(نقش انور ص ۱۰۹ تا ۱۱۲)

تنخواہ لے کر مدرسہ کے چندہ میں جمع کر لیتے:

خود فرماتے تھے کہ جب میں نے شروع شروع میں مدرسہ امینیہ میں پڑھانا شروع کیا ۱۳۱۵ھ تھا، شروع شروع میں مدرسہ میں کوئی آمدنی نہ تھی محض توکل پر گذارہ تھا، پھر دو سال کے بعد اہل دہلی کو توجہ ہوئی اور مدرسہ میں روپیہ آنے لگا تو مہتمم صاحب نے میری تنخواہ پانچ روپے کر دی۔ میں وہی پانچ روپے مدرسے میں ماہوار چندہ دے دیتا تھا، پھر آئندہ سال میری تنخواہ دس روپے ہوگئی۔ پانچ روپے تو میں چندہ ماہوار مدرسے کو دے دیتا اور پانچ روپے مہتمم صاحب کی ملک کر دیتا کہ آپ مجھے اللہ کے واسطے کھانا دے دیا کریں۔ (انور انوری ص ۱۳)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب : ۲

علمی تبحر، بے مثال حافظہ، ذوقِ مطالعہ اور حیرت انگیز مطالعاتی یادداشتیں

ہمارے اکابرؒ کو ربّ ذوالجلال نے بے شمار گوناگوں اوصاف کے ساتھ متصف فرمایا تھا، مگر ان کی زندگی کا ممتاز ترین وصف ان کا علمی انہماک اور ذوقِ مطالعہ تھا۔ یہی ان کا مقصد تھا، یہی منزل تھی، ان کا عشق، ان کی محبت، ان کی اطاعت، ان کے جذبات، ان کا شعور، ان کا فکر اور زندگی کا ہر زاویہ شوقِ علم اور مطالعاتی انہماک سے وابستہ تھا۔ آج کے دور میں شاید کسی کو یہ باتیں ناممکن معلوم ہوں، ممکن ہے کوئی ان باتوں کو مبالغہ پر محمول کرے، مگر ہمارے اسلاف کی تاریخ یہی ہے۔ ہمارے اسلاف واکابر کے مطالعاتی ذوق کو ان کے تذکرہ نگاروں نے مستقل بابوں میں لکھا ہے۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی علمی زندگی کی مرغوب غذا کتب بینی اور خدمتِ علم تھی۔ خود فرمایا کرتے: میں ہر وقت فکرِ علم میں مستغرق رہتا ہوں، بجز اُن اوقات کے جب نیند کا شدید غلبہ ہو

کر رہا ہے تجھ سے باتیں بے خودیٔ شوق میں
تیرے دیوانے کی تنہائی بھی لطف انگیز ہے

ذوقِ مطالعہ :

حضرت مولانا سید محمد ادریس صاحب سکھروڈوی لکھتے ہیں :

حضرت شاہ صاحب "لیل ونہار، صبح وشام کتب بینی میں مصروف رہتے، جس وقت بھی کوئی دیکھنا چاہتا تو کتاب کے مطالعہ ہی میں دیکھتا۔ کتاب سے الگ ہو کر بھی فکر، خیال

کتاب ہی میں رہتا تھا، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، غرضیکہ کوئی ساعت ایسی نہ تھی جس میں خالی الذہن ہو کر وقت گذارتے ہوں۔ شب میں چند گھنٹوں کے سوا جن میں آپ سو جاتے، بیشتر حصہ کتب کے مطالعہ میں ہی صرف ہوتا تھا۔ ابتدائے شب میں بارہ (۱۲) بجے تک کتاب دیکھتے رہتے، نیند کے غلبہ سے جب عاجز ہو جاتے سو جاتے اور دو ایک گھنٹہ کے بعد اٹھ کر وضو فرماتے اور کتاب لے کر بیٹھ جاتے۔ صبح صادق ہونے تک مطالعہ میں گذار دیتے اور صبح کی نماز کے بعد بھی پھر کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہو جاتے۔ ایک مرتبہ خود ہی مجھ سے فرمایا کہ میں کسی وقت بھی دماغ کو فارغ نہیں چھوڑتا ہوں۔ اُن چند گھنٹوں کے سوا جس میں مجھے نوم غرق ہوتی ہے میرا فکر کتاب یا کسی مسئلہ کی تحقیق میں رہتا ہے۔

فکرِ کتاب اور علمی تحقیق :

بارہا ایسا دیکھا گیا کہ نماز کے لئے مسجد جا رہے ہیں اور کوئی بات کسی حدیث یا کسی مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوئی تو مسکراتے ہوئے تشریف لے جا رہے ہیں اور نماز کے بعد فوراً کتاب اُٹھائی اور دیکھنا شروع کیا اور مسکراتے ہوئے ہی کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ کبھی بغیر کتاب کے بیٹھے ہوئے کسی فکر میں متفکر دیکھا تو جلدی جلدی کتاب اُٹھائی اور مسکراتے ہوئے یادداشت کے طور پر لکھنے لگے۔ غرضیکہ دن رات کی تمام ساعتوں میں آپ کی فکر کتاب اور علمی تحقیق کے باہر نہ ہوتی تھی۔

بڑی بڑی ضخیم کتاب کو ایک مرتبہ ابتداء سے دیکھنا شروع کیا اور ایک دو دن ہی میں از اول تا آخر دیکھ کر ختم کر دیا۔ ہزار ہا صفحات کی کتاب جب تک ختم نہ فرما لیتے، علیحدہ نہ فرماتے اور بہت جلدی ختم کر دیتے۔

مشغلۂ لیل و نہار :

مولانا نکہروڑوی لکھتے ہیں :

میں ۲۸ھ کے ختم پر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا۔ حضرت شاہ صاحب بھی غالباً اسی ۲۸ھ کے ابتداء میں دارالعلوم میں بسلسلہ درس تشریف فرما ہوئے تھے۔ حسن اتفاق سے مجھے خدمت کا شرف مدرسہ میں داخل ہونے کے چند ماہ بعد ہی حاصل ہو گیا تھا۔ میں نے لیل و نہار، صبح و شام، مرض و صحت، غرضیکہ ہر حال میں کتاب ہی کے ساتھ مشغلہ دیکھا، آپ کے پاس آنے والے آتے، کوئی بات دریافت کرتے جواب دے کر فوراً ہی کتاب پر نظر فرما لیتے۔

زیرِ مطالعہ کتب اور شوق کتب بینی :

مولانا نکہروڑوی نے لکھا ہے :

جہاں تک یاد کام کرتی ہے، زیرِ مطالعہ کتب دینیہ ہی ہوتی تھیں۔ درسیات میں حدیث و فقہ و تفسیر کی کتاب گاہ بگاہ ہی دیکھتے ہوئے پایا۔ بیشتر متقدمین کی کتب شروح احادیث زیرِ مطالعہ ہوتی تھیں اور خصوصیت سے حافظ ابن قیم، حافظ ابن دقیق العید اور اسی قسم کے لوگوں کی کتابیں جو جدید طبع ہو کر آتی تھیں، اُن کو بڑے شغف کے ساتھ مطالعہ فرماتے تھے اور جس کتاب جدید کے طبع ہونے کا علم ہوتا فوراً اس کے حصول کی کوشش فرماتے اور حاصل کر لیتے۔

مستدرک جس وقت حیدر آباد میں طبع ہونی شروع ہوئی، یہ زمانہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم و مغفور کے حیدر آباد میں اُمورِ مذہبیہ کے عہدہ پر تقرر کا زمانہ تھا۔ کتاب موصوف کے طبع ہونے کا جب علم ہوا تو حیدر آباد کے اس ادارہ کو بہت دعائیں

ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان مرحوم نے جب ایک جلد طبع ہوگئی فوراً بھیج دی اور ساتھ ہی لکھا کہ اگرچہ کتاب پوری طبع ہونے پر شائع ہونے کا قاعدہ ہے، مگر آپ کے ساتھ خصوصی رعایت کی وجہ سے ایک حصہ بھیج رہا ہوں اور باقی دوسری مرتبہ ارسال خدمت کردی جائے گی۔ مجلد کراکر بذریعہ رجسٹری یہ حصہ ارسال کیا۔ کتاب کے وصول ہونے پر جو خوشی چہرہ سے نمایاں ہورہی تھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور جو دعائیں زبان مبارک سے جاری تھیں سننے سے وابستہ ہیں۔

اسی طرح جب طنطاوی کی تفسیر مصر میں طبع ہونی شروع ہوئی ایک ایک پارہ کرکے اُس کو منگایا۔ جتنا حصہ طبع ہوتا رہا وہ آتا رہا، اور جس وقت جو حصہ آتا سب مطالعہ چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہوجاتے۔

تفسیر مظہری کی طباعت کی تمنا :

مولانا محمد ادریس سکھروڈوی تحریر فرماتے ہیں :

قلمی کتب جو طبع نہ ہوئی تھیں، اُن کی طبع اور اشاعت کا اشتیاق اکثر ظاہر فرمایا کرتے تھے۔ تفسیر مظہری کے طبع کے انتظام کی طرف اکثر لوگوں کو توجہ دلاتے تھے اور بہت تعریف فرمایا کرتے اور تمنا تھی کہ یہ تفسیر کسی طرح طبع ہوکر معرض وجود میں آجائے۔

جملہ علوم وفنون میں اقتدار کامل :

مولانا سکھروڈوی کا بیان ہے کہ :

جو کتاب زیر درس ہوتی اُس کا مطالعہ محض درس کی غرض سے کبھی بھی نہیں دیکھتے تھے۔ اپنے ہی ذوق اور علمی تحقیق کے پیش نظر کتاب کا مطالعہ فرماتے تھے۔

دعوت مناظرہ کا فوراً عملی جواب :

مولانا سکھروڈوی کا بیان ہے کہ :

ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحبؒ نے بیان فرمایا کہ میرٹھ میں ایک مولوی صاحب غیر مقلد تھے۔ غالباً اُن کا نام مولوی احمد اللہ فرمایا تھا۔ یہ مولوی صاحب غیر مقلد بیشتر حنفیوں کے ساتھ اُلجھتے اور دعوت مناظرہ دیتے رہتے تھے۔ میرٹھ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے نام کی شہرت ایک مناظرہ کی وجہ سے ہوچکی تھی جو تھوڑے ہی زمانہ پہلے مقام گلاؤٹھی میں ہوچکا تھا اور غیر مقلدوں کو سخت ہزیمت ہوئی تھی اور ایک ہی نشست کے بعد پیچھے سے بھاگ نکلے تھے۔ اس مناظرہ گلاؤٹھی میں دیوبند کے علماء میں سے بڑے بڑے علماء جمع ہوئے تھے اور مولانا گنگوہیؒ کی خاص توجہ اس مناظرہ کی طرف تھی۔ مولانا گنگوہیؒ نے دیوبند سے بہ حیثیت سرپرست دارالعلوم ہونے کے سب ہی کو گلاؤٹھی پہنچنے کا امر فرمایا تھا۔ اس کے بعد بھی مولانا احمد اللہ غیر مقلد کا حنفیوں کو دعوت مناظرہ دینا باعث تعجب تھا۔

میرٹھ کے دو صاحب مولوی احمد اللہ صاحب سے دعوت مناظرہ کا کاغذ لے کر حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس دہلی سنہری جامع مسجد میں قبل از عشاء پہنچے اور شاہ صاحبؒ کو کاغذ دعوت مناظرہ دکھلایا۔ شاہ صاحب اُسی شب میں دہلی سے میرٹھ کے لئے روانہ ہوگئے اور آخر شب میرٹھ پہنچ کر مولوی احمد اللہ غیر مقلد کے محلہ کی مسجد میں قیام فرمایا اور صبح قریب ہونے تک تھی لیٹ گئے، جو دو صاحب میرٹھ کے ساتھ تھے، اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ شاہ صاحبؒ کے ساتھ کوئی کتاب تو ہے نہیں' دوسرے نے جواب دیا کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ جب صبح ہوگئی تو نماز صبح اُسی مسجد میں پڑھی' مولوی احمد اللہ بھی نماز میں موجود تھے، بعد اختتام نماز مولوی احمد اللہ سے ملاقات کی اور فرمایا کہ یہ تحریر آپ کی ہے

"انہوں نے جواب دیا کہ ہاں میری ہے۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا بسم اللہ! میں موجود ہوں بیٹھ جایئے اور مسئلہ معین فرما لیجئے اور جونسا بھی مسئلہ آپ چاہیں اختیار کر لیں اور شروع کر دیں۔ مولوی احمد اللہ نے کہا آپ ہی شروع فرمایئے۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ آپ کے خیال میں زیادہ زوردار ہے، اس کو شروع کروں یا کوئی اور مسئلہ جو آپ کہیں؟ جواب دیا کہ اسی مسئلہ کے متعلق فرمایئے جو لوگ نماز میں موجود تھے بیٹھ گئے اور کچھ لوگ جن کو اطلاع ہوئی وہ بھی آ گئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں شروع کرتا ہوں، میری طرف سے صرف ایک شرط ہے کہ جب تک میں ختم نہ کرلوں آپ درمیان میں نہ بولیں، جو کچھ اعتراض و سوال ہو بعد میں کہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے متواتر دو گھنٹے فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ پر پوری بسط و تفصیل کے ساتھ تقریر فرمائی اور کوئی حدیث موافق و مخالف، ضعیف و قوی، مع حوالہ کتب نقل کئے بغیر نہ چھوڑی۔ تقریر ختم کرنے کے بعد فرمایا کہ اب آپ کو جو کچھ کہنا ہو فرمایئے۔ (کاتب الحروف نے یہ سن کر عرض کیا کہ اس کو کیا یاد رہا ہوگا فرمایا یوں ہی ہوا) جواب میں کہنے لگا کہ مجھے تو کچھ یاد نہیں رہا۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا، اسی پر حدیث دانی کا دعویٰ کرتے ہو، کہنے لگا، میں نے تو دعویٰ نہیں کیا۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ لکھ دیجئے مجھے حدیث دانی کا دعویٰ نہیں۔ غرض لکھ کر دے دیا۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بیشک جو ائمہ کی توقیر نہیں کرتا حق تعالیٰ اس کے حفظ کو سلب کر لیتے ہیں۔ یہ دن جمعہ کا تھا۔ آپ نے جمعہ میرٹھ میں ادا کیا۔ تمام شہر میں رفتہ رفتہ اس مناظرہ کا چرچا ہو گیا۔ لوگوں نے جمعہ کے بعد جامع مسجد میں شاہ صاحبؒ کو گھیر لیا اور کہنے لگے کہ باقاعدہ مناظرہ ہو کر اس سے تحریر لیجائے۔ لوگوں کا مجمع کثیر شاہ صاحبؒ کو لے کر مولوی احمد اللہ کے محلہ کی مسجد میں جا پہنچا۔ مولوی احمد اللہ نے لیت و لعل کر کے پولیس بلوالی اور فتنہ کے خوف سے پولیس انسپکٹر نے مجمع کو

منتشر کر دیا۔ یہ واقعہ خود شاہ صاحب کی زبانی سنا ہوا نقل ہے جس سے آپ کی یادداشت و حفظ اور احادیث پر کس قدر وسیع نظری کا پتہ چلتا ہے۔ (حیات انور ص ۳۳۳، ۳۳۴)

خسر الدنیا والآخرۃ :

حضرت شاہ صاحبؒ اپنے درس میں صرف علمی تحقیقات بیان فرمانے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ساتھ ساتھ طلبا کو اعمال و اخلاق کی اصلاح کی طرف بھی متوجہ فرماتے تھے۔ ایک روز طلبا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے اس علم میں دنیا تو کبھی تھی ہی نہیں اس کے ذریعے دین ملا کرتا تھا۔ افسوس کہ وہ بھی تم نے نہ لیا، خسر الدنیا والآخرۃ۔

کتاب بھی تو ایک روگ ہے :

ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحبؒ بیمار تھے اور علالت طول پکڑ گئی تھی۔ ایک صبح فجر کی نماز کے وقت یہ افواہ مشہور ہو گئی کہ حضرت کا وصال ہو گیا۔ خدام پر بجلی سی گر گئی اور نماز فجر کے بعد سب حضرتؒ کے مکان کی طرف لپکے۔ گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ بحمد للہ خبر غلط تھی۔ البتہ تکلیف کی شدت برقرار تھی۔ سب لوگ حضرت کی عیادت کیلئے کمرے میں پہنچے تو دیکھا حضرت شاہ صاحبؒ نماز کی چوکی پر بیٹھے ہیں، سامنے تکیہ پر کتاب رکھی ہے اور اندھیرے کی وجہ سے حضرت شاہ صاحبؒ جھک کر کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ہمت کر کے عرض کیا:

حضرت! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اول تو کون سی بحث رہ گئی ہے جو آپ کے مطالعہ میں نہ آچکی ہو اور اگر بالفرض کوئی بحث ایسی ہو تو اس کی فوری ضرورت کیا پیش آ گئی ہے کیا اسے چند روز تک موخر نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا بھائی تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ کتاب بھی تو ایک روگ ہے اس روگ کا کیا کروں؟

(اکابر دیوبند ہاتھے ۶۳)

علمی پناہ گاہ :

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ :

حضرت شاہ صاحبؒ کو اللہ نے غیر معمولی حافظہ اور علوم کا حیرت انگیز استحضار عطا فرمایا تھا، وہ محتاج بیان نہیں۔ حضرت والد (مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ) فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند میں منطق کی مشہور کتاب "ملا حسن" کا درس میرے سپرد تھا، مجھے مطالعے کے دوران اس کے ایک مقام پر اشکال پیدا ہوا۔ جب بھی کوئی علمی اشکال پیدا ہوتا تو حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات ہماری پناہ گاہ تھی۔ چنانچہ میں اُن کے پاس پہنچ گیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ اس وقت کتب خانہ کی بالائی گیلری میں بیٹھے مطالعہ میں مشغول تھے اوپر ہی سے مجھے آتے دیکھا تو سلام کے بعد پوچھا کیسے آنا ہوا؟

میں نے عرض کیا کہ ملا حسن کے ایک مقام پر اشکال پیش آ گیا ہے۔ وہ حل کرنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جواب میں حضرت شاہ صاحبؒ مجھے اوپر بلالیں گے لیکن حضرتؒ نے بلانے کے بجائے وہیں بیٹھے بیٹھے فرمایا کون سا مقام ہے؟ عبارت پڑھئے۔ میں نے عبارت پڑھی اور ابھی اپنے اشکال کی وضاحت بھی نہیں کی تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے وہیں سے فرمایا، اچھا تمہیں یہاں یہ اشکال ہوا ہوگا۔ پھر اشکال کی تقریر بھی خود فرمائی اور جواب بھی وہیں بیٹھے بیٹھے اس طرح دے دیا کہ مجھے مسئلے میں مکمل اطمینان ہو گیا۔

حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے، اگر کوئی تفسیر حدیث یا فقہ کی کتاب ہوتی تو مجھے اتنا تعجب نہ ہوتا لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ منطق کی اس کتاب کے بارے میں پوچھنے کیا تھا جسے پڑھاتے ہوئے حضرت شاہ صاحب کو یقیناً سالہا سال گذر چکے تھے لیکن اس سوال و جواب سے اندازہ ہوا کہ یہ کتاب بھی حافظے میں پوری طرح محفوظ ہے۔

(اکابر دیوبند کیا تھے ص [illegible])

فتح الباری کا مطالعہ :

ایک دفعہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فتح الباری (جو کہ تیرہ جلدوں میں بخاری شریف کی مبسوط شرح ہے) کا تیرہویں مرتبہ مطالعہ کر رہا ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ میں درس کے لئے مطالعہ نہیں کرتا۔ مطالعہ کا مستقل سلسلہ ہے اور درس کا مستقل۔ ایک مرتبہ فرمایا جس کتاب کا سرسری طور پر بھی مطالعہ کر لیتا ہوں پندرہ سال بقید صفحات اس کے مضامین محفوظ رہ جاتے ہیں۔ مطالعہ بڑی تیزی کے ساتھ فرماتے۔

چنانچہ فتح القدیر جو آٹھ جلدوں میں ہزارہا صفحات پر مشتمل ہے اس کا مطالعہ بیس روز میں فرمایا اور چھبیس (۲۶) سال کے بعد فرمایا، ایک بار مطالعہ کے بعد پھر مطالعہ کی ضرورت پیش نہیں آئی

دیکھا جو اپنے دل میں وہ دیکھا نہ پھر کہیں
یوں تو میری نگاہ سے دنیا گذر گئی

حضرت شاہ صاحبؒ کے قوت حافظہ، ذہانت، سرعت مطالعہ، حفظ و استحضار اور وسعت علم کے اتنے واقعات اور مشاہدات سوانح نگاروں نے لکھے ہیں کہ اس کے لئے ایک مستقل کتاب چاہئے۔

کتابوں کی فوراً نشاندہی کر دی :

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اس حوالے سے اپنا واقعہ یوں نقل کرتے ہیں :

میں حضرت شاہ صاحبؒ کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ حسب معمول بزرگانہ شفقت سے پیش آئے۔ چائے وغیرہ سے تواضع کے بعد متوجہ ہوئے، فرمایا مولوی

صاحب! کیسے تشریف لائے؟

میں نے عرض کیا حضرت! ''ابوالحسن کذاب'' کا ترجمہ نہیں ملتا، اس کے بارے میں نشان معلوم کرنے حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا ادب و تاریخ کی فلاں فلاں کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مطالعہ کر لیجئے۔ تقریباً آٹھ دس کتابوں کے نام لے دیے اور ان کے مظان و مواقع کی نشان دہی فرما دی۔ میں نے عرض کیا: حضرت! مجھے اس شخص کی پوری تاریخ معلوم کرنی نہیں، صرف اس کی صفت کذب و دروغ گوئی کے حالات معلوم کرنے ہیں، مگر ان کا کوئی عنوان کسی کتاب میں نہیں ملتا کہ اس کے نیچے ان خاص واقعات کا مطالعہ کروں۔

فرمایا: مولوی صاحب! آپ نے بھی کمال کر دیا۔ صفت کذب کونسی صفت مدح ہے کہ لوگ اس پر عنوانات قائم کر کے اس کے واقعات دکھلائیں، ایسی مذموم صفات و افعال کا تذکرہ تو ضمناً اور استطراداً آ جاتا ہے، عنوانات ہمیشہ کمالات پر قائم کیے جاتے ہیں نہ کہ نقائص و عیوب پر۔ ان کتب میں فلاں فلاں مقام دیکھ لیجئے۔ ضمناً اس کی صفت کذب کا تذکرہ کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔

تیس سال قبل کا مطالعہ آج مستحضر ہو گیا:

میں نے عرض کیا حضرت! مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء بھی یاد نہیں ہوں گے، چہ جائیکہ ان کے یہ مظان اور مواقع محفوظ رہیں۔ بس آپ ہی اس شخص کے کذبات اور دروغ گوئی سے متعلق واقعات کی دو چار مثالیں بیان فرما دیں۔ میں ان ہی کو آپ کے حوالے سے جزو کتاب بنا دوں گا۔ اس پر مسکرا کر ابوالحسن کذاب کی تاریخ اس کے سن ولادت سے سن وفات تک بیان فرمانا شروع کر دی، جس میں اس کے جھوٹ کے عجیب و غریب

واقعات بیان فرماتے رہے۔ آخر میں سن وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا، پھر اس جھوٹ کی تفصیل بیان فرمائی۔ حیرانی یہ تھی کہ یہ بیان ایسے طرز سے ہو رہا تھا کہ گویا حضرت شاہ صاحبؒ نے آج کی شب میں مستقلاً اسی کی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا جو اس بسط سے سن وار واقعات بیان فرما رہے ہیں۔

میں نے تعجب آمیز لہجہ میں عرض کیا کہ حضرت! شاید کسی قریبی زمانہ میں اس کی تاریخ دیکھنے کی نوبت آئی ہوگی۔ سادگی سے فرمایا جی نہیں آج سے تقریباً تیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا تھا، خدیوی کتب خانہ میں مطالعہ کیلئے پہنچا تو اتفاقاً اسی ابوالحسن کذاب کا ترجمہ سامنے آ گیا اور اس کا مطالعہ دیر تک جاری رہا بس اس وقت جو باتیں کتاب میں دیکھیں حافظہ میں محفوظ ہو گئیں اور آج آپ کے سوال پر مستحضر ہو گئیں۔

عبارت میں جعل اور تصرف کیا گیا:

تحریک خلافت کے دور میں جب امارت شرعیہ کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سبحان اللہ خان نے اس مسئلہ میں اپنے بعض نقطۂ نظر کی تائید میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جو ان کے نقطۂ نظر کی تو مؤید تھی مگر مسلک جمہور کے خلاف تھی۔ یہ عبارت وہ خود لے کر دیوبند تشریف لائے اور مجمع علماء میں اُسے پیش کیا تمام اکابر علماء دیوبند حضرت شاہ صاحبؒ کے کمرہ میں جمع تھے۔ حیرانی یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو رد کر سکتے تھے کیونکہ وہ سلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی اور نہ اسے قبول کر سکتے تھے کہ مسلک جمہور کے صراحۃً خلاف تھی۔ یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اسے کسی تاویل و توجیہ سے بھی مسلک جمہور کے مطابق نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ استنجا کے لئے تشریف لے گئے تھے، وضو کر کے واپس

ہوئے۔ اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق وتوفیق بھی نہیں بن پڑتی۔

حضرت شاہ صاحب حسب عادت حسبنا اللہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا، اس عبارت میں خلل اور تصرف کیا گیا ہے اور دو سطروں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ درمیان کی ایک سطر چھوڑ دی گئی ہے۔ اسی وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی، دیکھا گیا تو واقعی اصل عبارت میں پوری ایک سطر درمیان سے حذف ہوئی تھی جوں ہی اس ساقط کردہ سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا، عبارت کا مطلب مسلک جمہور کے موافق ہوگیا اور سب کا تحیر رفع ہوگیا۔ (حیات انور ص [illegible])

تدلیس وتحریف کو بے نقاب کردیا:

محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا بیان ہے کہ:

ایک مرتبہ کشمیر کے سفر میں دو فریق جو کسی مسئلہ میں الجھ رہے تھے اور دونوں نے اختلافی مسئلہ میں فتویٰ ترتیب دے کر بعض کتابوں سے تائیدی عبارتیں بھی نقل کی تھیں۔ ان میں سے ایک جماعت نے فتاویٰ عمادیہ نامی قلمی کتاب کا حوالہ دے کر اپنے بیان کو مدلل کیا۔ جب یہ فتویٰ آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے دیکھتے ہی فرمایا: میں نے دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں فتاویٰ عمادیہ کے غیر مطبوعہ نسخہ کا مکمل مطالعہ کیا ہے۔ اس میں یہ عبارت قطعاً نہیں۔ یہ تدلیس اور کھلی تحریف ہے۔ اس بیان پر اہل علم کی جماعت متحیر ہو کر رہ گئی۔ (نقش دوام ص ۱۳۰)

حیرت انگیز مطالعاتی یادداشت:

بہاولپور کے مشہور مقدمہ میں حضرت شاہ صاحب نے قادیانیت کے خلاف کئی

روز تک مسلسل بیان دیا۔ ایک روز اس مفصل تقریر پر جو آپ نے ختم نبوت کو ثابت کرنے کے لئے "تواتر" سے متعلق فرمائی جس سے آپ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہمارا دین متواتر ہے اور تواتر کا انکار کرنے والا مرتد اور کافر ہے۔ اس ذیل میں اپنی اجتہادی تحقیق تواتر کی چہارگانہ تقسیم، ان کی تعریف اور مثالوں سے تشریح وتفصیل کی تو جلال الدین شمس قادیانی نے آپ کو مخاطب فرما کر کہا کہ آپ تواتر کے منکر کو کافر کہتے ہیں حالانکہ "بحر العلوم" نے فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت" میں امام فخر رازی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ تواتر معنوی کے منکر ہیں۔ اس پر شاہ صاحبؒ نے جج سے فرمایا" آپ ان سے یہ کتاب اور حوالہ طلب کیجئے میرے پاس اس وقت یہ کتاب موجود نہیں"۔

جلال الدین شمس قادیانی کتاب ہاتھ میں لے کر ورق گردانی کرنے لگا تو آپ پرجوش انداز میں کھڑے ہوگئے اور کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی اور جج سے فرمایا کہ:

"یہ صاحب ہمیں دھوکہ دینا چاہتے ہیں لیکن میں طالب علم ہوں دو چار کتابیں دیکھی ہیں ان سے میں مُفحم (خاموش) نہیں ہوں گا۔ بتیس (۳۲) سال ہوئے میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا، بحر العلوم نے یہ نہیں لکھا کہ "رازی" "تواتر معنوی کا انکار کرتے ہیں بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ امام رازی حدیث " لا تجتمع امتی علی الضلالہ" کے متواتر معنوی ہونے کا انکار کرتے ہیں"۔

تواتر کی چار قسمیں:

پھر فرمایا: دین محمدی کا جناب رسول اللہ ﷺ سے ثبوت یا تواتر سے ہے یا خبر واحد سے۔ تواتر کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اعظم ﷺ سے کوئی بات متصلاً پہنچی ہو اور اس میں غلطی کا کوئی امکان نہ ہو۔ تواتر کی چند صورتیں ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔ تواتر ہمارے

دین میں چار قسم پر ہے۔ حدیث "من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعده من النار" حدیث متواتر ہے اور تیس (۳۰) صحابہ کرامؓ سے بسند صحیح مذکور ہے۔ اس کو تواتر اسنادی کہا جاتا ہے۔ نزول مسیح کے سلسلہ میں ہمارے پاس چالیس احادیث متواتر موجود ہیں ان کا انکار کفر ہے"۔

تواتر کی دوسری قسم "تواتر طبقہ" ہے جس میں معلوم نہیں ہوتا کہ ایک چیز کو کس نے کس سے لیا، مگر اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ پچھلوں نے اگلوں سے لی تھی۔ قرآن مجید کا تواتر اسی تواتر کے ذیل میں آتا ہے۔ اس کا منکر بھی کافر ہے۔ یہ بیان فرماتے ہوئے آپ نے ایک اہم بات یہ بھی ارشاد فرمائی کہ :

"مسواک کا ثبوت بھی اوپر ذکر کردہ دونوں تواتر کے ذیل میں آتا ہے اس لئے مسواک کے ترک استعمال میں تو کوئی حرج نہیں لیکن پیغمبر ﷺ سے اس کے استعمال کے ثبوت کا انکار کفر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہہ دے کہ "جو" (غلہ) حرام ہے تو وہ کافر ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے "جو" کھائی ہے اور امت اب تک "جو" کھاتی چلی آئی ہے۔ اس تواتر قطعی کا انکار بھی کفر ہوگا حالانکہ "جو" کا کھانا نہ کھانا کوئی بڑی بات نہ تھی"۔

تواتر کی تیسری قسم "قدر مشترک" ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ بہت سی حدیثیں خبر واحد کی شکل میں آتی ہوں لیکن ان سب کا مضمون اور مفاد تواتر کی حد تک پہنچ گیا جس کی مثال آنحضور ﷺ کے معجزات ہیں کہ ان میں سے بعض متواتر ہیں اور بعض خبر آحاد۔ ان اخبار آحاد میں ایک مضمون مشترک ملتا ہے جو قطعی ہے اس کا بھی منکر کافر ہے۔

تواتر کی چوتھی قسم تواتر توارث ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک نسل نے دوسری نسل سے لیا ہو، مثلاً تمام امت اس علم میں مساوی طور پر شریک ہے کہ :

"خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا"۔

اس تواتر کا انکار بھی کفر ہے، متواترات میں تاویل اور ان کے مطالب کو مسخ کرنا بھی کفر ہے۔ (ساعتے با اولیاء ص ۱۷۸)

بے نظیر وسعت مطالعہ :

حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ رقمطراز ہیں :

"ہمارے اطراف میں کچے چنوں کو بھون کر کھانے کا رواج ہے۔ رات کے اوقات میں چنے بھوننے کا بچے اہتمام کرتے رہتے ہیں اور بعد میں بڑے بھی اس میں شریک ہوجاتے ہیں۔ عوام میں مشہور ہے کہ منہ لگا غلام اور منہ لگا چنا چھوٹتا نہیں۔ غلط نہیں واقعہ یہ ہے کہ ایک بار ہم سب بچے مکان کے صحن میں بھنے ہوئے چنے کی مجلس سے لطف اندوز ہورہے تھے کہ والد مرحوم (حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ) جنہیں اس زمانہ میں بواسیر کا شدید دورہ لاحق تھا، اپنے کمرہ سے عشاء کا وضو کرنے کیلئے باہر تشریف لائے، سیدھے آکر ہمارے قریب بیٹھ گئے اور چنوں کی فرمائش کی، بچوں نے چینی کی طشتری میں چنے نکال کردیے، آپ انہیں تناول فرمارہے تھے کہ ماموں حکیم محفوظ علی صاحب مزاج پرسی کیلئے تشریف لائے۔ عرض کیا حضرت ! بواسیر کی شدت میں آپ چنے استعمال فرمارہے ہیں یہ تو بے حد مضر ہیں۔ فرمانے لگے، مولوی صاحب فلاں کتاب کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ فلاں صورت میں اگر بواسیر کا عارضہ ہو تو چنا مضر نہیں۔ حکیم صاحب نے نشان زدہ کتاب سے مراجعت کی تو آپ کی اس بے نظیر وسعت مطالعہ کے معترف ہوگئے۔ (نقش دوام ص ۱۱۷)

☆☆☆☆☆☆☆☆

باب : ۳

طالبانِ علومِ نبوت پر شفقت، تشجیع و تربیت، تسامح و عنایت اور بے تکلفی و ظرافت

اسلام میں حصول علم کی روایت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ محمد عربی ﷺ کے دور مقدس میں مدرسے کی ابتدائی شکل مسجد نبوی میں صفہ پر وجود میں آئی۔ جہاں نبی کریم ﷺ کے جانثار، عاشق زار اور محب کالے، گورے، آزاد و غلام اور عربی عجمی امتیاز کے بغیر حصول علم میں مصروف رہتے تھے۔ اسلامی معاشرے میں مدرسہ اس قدر اہمیت کا حامل ہے جتنا انسانی زندگی کے لئے ہوا، غذا اور ضروریات زندگی۔

دینی مدارس نے ہمیشہ ایسے افراد تیار کئے جنہوں نے اپنے دائرے میں اسلام سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اللہ کی بندگی، اللہ کے بندوں کا تزکیہ اور اللہ کے دین کی اقامت کیلئے دن رات محنت کی اس حوالے سے دارالعلوم دیوبند کی روشن مثال ہمارے سامنے ہے۔

طلبا کی تربیت پر توجہ :

دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز سپوت حضرت امام کشمیریؒ کو رب ذوالجلال نے اپنی بارگاہ وفیاض سے بہت سے محاسن واوصاف عنایت فرمائے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے تلامذہ کے دلوں میں علم دین کی عظمت واہمیت پیدا کی اور انہیں تزکیہ نفس، اصلاح باطن، اصلاح اعمال اور فکری وذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ اس طرح تیار کیا کہ ان کی طالب علمانہ زندگی عملی زندگی میں بارآور ثابت ہو۔

ملاء اعلیٰ کی دنیا :

حضرت امام کشمیریؒ کا یہ مقولہ حضرتؒ کے شاگردوں میں بہت مشہور تھا، جو شخص

قرآن وحدیث اور دوسرے دینی علوم کو محض شکم پروری کیلئے پڑھتا ہے وہ بازار سے قیمتی
شال اس لئے خرید کر لاتا ہے کہ اس سے اپنے جوتے صاف کرے۔ حضرت امام کشمیریؒ
اپنے تلامذہ کو صرف نفس کتاب پڑھا دینے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی سیرت و کردار،
اخلاق و عادات اور عبادات و معاملات کو سنوارنے کی طرف بھی توجہ دیتے تھے۔ حضرت
امام کشمیریؒ کے نزدیک علم تعلیم، معلم اور متعلم کی دنیا ملاء اعلیٰ کی دنیا ہے جس کو پاک صاف
رکھنے کے لئے شکم پروری اور زر پرستی کی دنیا سے دور اور بلند و بالا رکھنا پڑھنے اور پڑھانے
والوں کا پہلا فرض ہونا چاہئے۔

حضرت امام کشمیریؒ کے حلقۂ درس میں جن خوش قسمت طالبان علوم نبوت کو
شامل ہونے اور آپ سے نسبت تلمذ کے شرف کا موقع ملا وہ اپنے وقت کے بہترین رجال
کار گردانے گئے اور انہوں نے دین و دنیا کے ہر شعبے میں قائدانہ، مجاہدانہ اور مدبرانہ کردار
ادا کیا۔

حضرت امام کشمیریؒ کی محنت، تربیت، شفقت، محبت اور حسن سلوک کی کہانی خود
حضرتؒ کے تلامذہ کے قلم سے نذر قارئین ہے۔

احوالِ باطن کا اخفاء :

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اپنے استاد مکرم حضرت امام کشمیریؒ کی باطنی
کیفیت اور ظرافت کی ایک جھلک نمایاں کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

اپنے باطنی حال کے اخفاء میں ان کی کوشش حد سے گذری ہوئی تھی، کھلنے کا موقع
اتفاقاً کہیں پیش آتا تو اس وقت ظرافت و مزاح کا لہجہ اختیار فرما لیتے۔ بظاہر عام مجلسوں
میں صحبتوں میں ان پر سکینت و وقار کی خاموشی طاری رہتی لیکن حلقۂ درس میں ظرافت،

مزاح کا جبلی رجحان نمایاں ہوتا۔ اس وقت ان کی زبان پر معصومانہ انداز میں بڑے پرکیف
فقرے جاری رہتے۔

ظرافت ولطائف میں حقائق کی تعلیم :

دورہ اختتام کی حد پر جب پہنچتا تو اس وقت اپنے مخصوص انداز میں فرماتے کہ
اب زیادہ دیر نہیں ہے کہ میں مرغیوں کی ڈربہ کو کھول دوں گا۔ مرغے جو ہمارے ارد گرد جمع
ہیں ڈربے سے نکلیں گے۔ دیکھتا ہوں بلندیوں پر چڑھ چڑھ کر بازوؤں کو پھڑ پھڑاتے
ہوئے کون بانگ دیتا ہے، کس کی آواز کتنی اونچی ہوتی ہے۔ اس قسم کے لطیفوں میں وہ سب
کچھ کہہ دیا کرتے تھے جو کہنا چاہتے تھے۔

درسگاہ میں ایک طالب علم سے خصوصی شغف رہتا تھا :

ہمارے ایک رفیق درس جن کا نام مولوی محمد عیسیٰ تھا، شاید جھکر نامی قصبہ کے رہنے
والے تھے۔ بیچارے بڑے متین اور سنجیدہ اور نیک آدمی معلوم ہوتے تھے۔ شدت نیکی کی
وجہ سے تعلق ان کا علم کے ساتھ بھی کچھ نیک ہی نیک سا تھا۔ شاہ صاحبؒ کے متصل دست
چپ کی طرف شروع ہی سے انہوں نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ وقت پر ٹھیک اپنی مقررہ جگہ پر
آکر بیٹھ جاتے، شاید کسی دوسرے طالب علم کی ہمت بھی نہ ہوتی تھی کہ ان کی جگہ پر قبضہ
کرے، ہوتا یہ تھا کہ کسی بلند و بالا مسئلہ پر شاہ صاحبؒ کے معلومات کا بحر ذخار موجیں مارتا
ہوا چلا جاتا ہے۔ حافظ الدنیا، شیخ ابن ہمام، شمس الائمہ سرخسی، ابن نجیم کا ذکر ہو رہا ہے کہ
اچانک شاہ صاحبؒ مولوی محمد عیسیٰ کی جانب متبسمانہ لہجہ میں مخاطب ہو جاتے، اور ان کی
طرف خطاب کر کے کچھ فرماتے۔ صحیح الفاظ تو اس وقت یاد نہ رہے اور الفاظ کی نوعیت ایک
رقتی کب تھی، تاہم حاصل یہی ہوتا تھا کہ جو کچھ بیان کیا گیا گویا مولوی عیسیٰ صاحب سے

اس کی تصدیق چاہی جاتی تھی۔ بیچارے مولوی محمد عیسیٰ خاموش مسکرا دیتے تھے۔ ہمارا اتفاق اس وقت صرف مسکراہٹ ہی مسکراہٹ، اور تبسم ہی تبسم بن جاتا تھا" ہاں مولوی محمد عیسیٰ صاحب تو آپ کی رائے اس مسئلہ میں کیا ہے"۔ یہ یا قریب قریب اسی کے عموماً ان سے سوال کیا جاتا۔ بظاہر مولوی محمد عیسیٰ صاحب کے وجود سے استرواح اور ازالۂ ملال وکلال کا کام لیا جاتا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایام درس کے طویل عہد میں ایسا گزرا ہو جس میں دلوں کے انبساط وانشراح کا یہ موقعہ اول یا آخر یا وسط میں نہ نکل آتا ہو۔ معلوم نہیں ہمارے یہ رفیق درس آج کل کہاں ہیں؟ کس مشغلہ میں ہیں؟ اسی دنیا میں ہیں یا اپنے محبوب استاذ اور سلف صالحین کے ساتھ لاحق ہو گئے، اگر اسی دنیا میں موجود ہیں تو ان سے معافی کا خواستگار ہوں۔ (احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن ص ۱۰۹)

کمالِ تواضع وعبدیت :

حضرت مولانا پروفیسر سعید احمد صاحب فرماتے ہیں :

ایک واقعہ لکھتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت الاستاذ کو چھوٹوں کی دلجوئی اور ان کی دلداری کا کس قدر خیال رہتا تھا۔ حضرت الاستاذ میری شادی میں شریک ہوئے اور حضرت نے ہی میرا نکاح پڑھایا تھا۔ یہ مہینہ مئی کا تھا جو آگرہ کے لئے بہت ہی شدید اور انتہائی سخت موسم ہے۔ بارات کو اعتماد پورہ جو آگرہ سے تین چار اسٹیشنوں کے فاصلہ پر ہے وہاں جانا تھا، ریل کے اوقات کی مجبوری کی وجہ سے دوپہر کو ٹھیک بارہ ڈھائی بجے کے قریب ہم لوگ آگرہ سے روانہ ہوئے اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اعتماد پور کے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ مگر منزل ابھی دو میل دور تھی۔ اسٹیشن سے قیام گاہ تک جانے کے لئے اس نواح کی مخصوص اور سخت تکلیف دہ سواری یعنی یکہ میں بیٹھنا تھا، پھر اس پر لطف یہ کہ راستہ نہایت ناہموار تھا۔

جگہ گڑھے اور نشیب وفراز وہ کہ الامان! گرمی اپنے شباب پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قافلہ یکوں پر سوار ہو کر اسٹیشن سے شہر کی جانب روانہ ہوا تو راستہ کی ناہمواری اور گڑھوں کی فراوانی کے باعث برا حال ہو گیا۔ حضرت شاہ صاحب ٹھہرے ایک نہایت ہی لطیف اور نازک مزاج بزرگ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہی یکہ رکوایا اور پاپیادہ ہو گئے، چلچلاتی دھوپ پڑ رہی اور لو چل رہی ہے۔ چاروں طرف سے مٹی کے تودے ہیں کہ فضا میں گشت لگاتے پھر رہے ہیں اور اسی عالم میں حضرت شاہ صاحبؒ منہ اور کانوں کو رومال سے لپیٹے ہوئے **حسبنا اللہ و نعم الوکیل** پڑھتے ہوئے قدم بڑھائے اعتماد پور کی آبادی کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے مقام آیا۔ ایک بڑے مکان میں انتظام تھا، وہاں ہم لوگوں کو پہنچا دیا گیا۔ یہاں لوگ پہلے سے موجود تھے، کوئی پنکھا لے کر دوڑا، اور کوئی پانی سے بھرا لوٹا لے کر آیا کہ سخت گرمی میں چل کر آئے ہیں۔ ذرا منہ ہاتھ دھو کر ٹھنڈے ہو لیجئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو صدر مجلس میں قالین پر بٹھا دیا گیا اور دو تین آدمی بڑے بڑے پنکھے لے کر جھلنے کھڑے ہو گئے۔ جب ذرا پسینہ خشک ہو گیا اور دم میں دم آ گیا تو دودھ کے شربت کا ایک بھرا ہوا گلاس میں خود لے کر حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں آنے کو آ تو گیا، ورنہ حق یہ ہے کہ شرم کے مارے نگاہ نہیں اٹھتی تھی کہ میری وجہ سے مولانا شبیر احمد صاحبؒ اور دوسرے حضرات کو عموماً اور حضرت الاستاذ کو خصوصاً کس قدر شدید تکلیف پہنچی ہے۔

اسی قسم کے خیالات اور احساس ندامت وشرمندگی تھا جس سے اس وقت دوچار ہو رہا تھا۔ اسی عالم میں دودھ کے شربت کا گلاس حضرت الاستاذ کی طرف بڑھایا۔ حضرت میرے چہرے بشرے سے سمجھ گئے، گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور خوش مزاجی کے ساتھ فرمایا.....

ع الا یا ایها الساقی ادر کاسا و ناولها

پھر ایک دو گھونٹ لینے کے بعد میری طرف دیکھ کر ذرا تبسم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اور مولوی صاحب" کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا"۔

(حیات انور ص ۲۱۹۲۷۱)

بے پناہ شفقت:

حضرت مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیت علماء ہند دہلی حضرت امام کشمیریؒ کا طالبان علوم نبوت سے برتاؤ اور طرز عمل کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

ایشائی اور مشرقی تہذیب استاذ کو باپ اور شاگردوں کو اولاد کا درجہ دیتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ اس کا عملی نمونہ تھے۔ آپ کی بے پناہ شفقت ہر وقت طلبہ علوم کے استقبال کے لئے وقف تھی۔ آپ کا دروازہ طلبہ کے لئے ہر وقت کھلا ہوا تھا۔ بدشوق طلبہ کو بھی آپ محبت و شفقت ہی سے گرویدہ کرنے کے عادی تھے۔

احقر وہ بدنصیب ہے جو حضرت کی نجی مجلس میں کبھی حاضر نہیں ہوا۔ حضرت کے حجرہ میں بھی شاید ایک مرتبہ ہی حاضری ہوئی۔ حلقہ درس میں بھی کوئی ممتاز حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس اجنبیت اور بُعد کے باوجود جب بھی حضرت شاہ صاحب سے واسطہ پڑا۔ احقر نے محسوس کیا کہ حضرت کی بے پناہ شفقت اس ناکارہ کے شامل حال ہے۔

ذاتی رائے پر طالب علم کی دلجوئی کو ترجیح دی:

سب سے پہلے ایک درخواست کے سلسلہ میں حاضر خدمت ہوا۔ اس وقت احقر درجہ وسطی کی کتابیں پڑھتا تھا۔ حضرت کے حلقہ درس میں شرکت کے لئے ابھی ایک دو سال باقی تھے۔ ذاتی تعارف کچھ نہ تھا، دارالعلوم کے سیکڑوں طلبہ میں سے ایک میں بھی تھا

یہ وہ وقت تھا کہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند "محاکم شرعیہ ریاست حیدرآباد" کے مفتی القضاۃ (چیف جسٹس) کی حیثیت سے حیدرآباد میں مقیم تھے اور نظام حیدرآباد کی نظر میں دارالعلوم کی خاص عظمت تھی۔ متعدد طلبہ ریاست کے وظائف سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ احقر کو بھی چند دوستوں نے مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک درخواست نہایت خوشخط ایک کاتب سے احقر نے بھی لکھوائی اور حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اس پر سفارش تحریر فرمادیں۔

حضرت شاہ صاحب کی رائے یہ تھی کہ اس قسم کی درخواستیں بے سود ہیں، وہاں کسی خاص تعلق کے بغیر صرف سفارشی الفاظ سے کام نہیں چلتا۔ (چنانچہ نتیجہً درخواست سے اس کی تصدیق ہوگئی کہ آج تک اس کی رسید بھی نہیں آئی) مگر آپ کے لطف کرم یکراں نے اس کی اجازت نہیں دی کہ اپنے رائے کو بالا رکھتے ہوئے سفارش لکھنے سے معذرت فرما دیں، جیسے ہی احقر نے درخواست عرض کی، آپ نے بلا تامل موثر انداز میں پرزور سفارش تحریر فرمادی۔ سفارش کے تمام الفاظ یاد نہیں رہے، البتہ ایک مصرع یاد ہے جو آخر میں تحریر فرمایا تھا ۔۔۔۔۔۔۔۔ ع خسرواں چہ عجب گر بنوازند گدارا

اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ احقر کی پھوپھی کا انتقال ہوگیا۔ احقر کا مکان اسٹیشن کی جانب دیوبند کے آخری کنارہ پر دارالعلوم دیوبند سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ حضرت شاہ صاحب کو معلوم ہوا تو آپ پاپیادہ تشریف لائے اور جہاں تک یاد پڑتا ہے، نماز جنازہ آپ نے ہی پڑھائی۔

فاش غلطیوں کے باوجود تسامح فرمایا:

دورۂ حدیث میں احقر کے ساتھ ختم سال پر تاسی (۸۷) طلبہ تھے۔ عبارت عام

طور پر مولانا احمد اشرف صاحب راندیری، مولانا اشفاق صاحب سنبھلی، مولانا محمود الحسن صاحب جالوئی (مرحوم) مولانا عبدالحنین صاحب ہزاروی، مولانا سیف اللہ ... حضرت شاہ صاحب (احقر کے مشفق دوست) مولانا مسعود احمد صاحب مراد آبادی وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بخاری شریف کے سبق میں اس مسابقت میں شرکت کا شوق احقر کو بھی ہوا۔ سب سے پہلی صف میں جا کر بیٹھا اور سب سے پہلے بسم اللہ پڑھ کر اپنا حق قائم کر لیا، مگر عبارت پڑھی تو چند فاش غلطیاں ہو گئیں۔ حضرت شاہ صاحب کو نحوی و صرفی غلطیوں سے بہت کوفت ہوتی تھی اور سختی سے تنبیہ فرمایا کرتے تھے، مگر حضرت نے محسوس فرمایا کہ یہ غلطیاں گھبراہٹ میں ہوئی ہیں، تو نہایت شفقت اور نرمی سے اصلاح فرمائی۔ چند سطریں پڑھی تھیں کہ ایک بحث شروع ہو گئی اور اسی بحث میں گھنٹہ ختم ہو گیا۔ جان بچی لاکھوں پائے پھر کبھی اس اقدام کی جرأت نہیں کی۔

نظرِ شفقت صلاحیت پر تھی:

ششماہی امتحان تھا۔ اُس زمانہ میں سہ ماہی یا ششماہی امتحان تقریری ہوا کرتے تھے۔ چند روز پہلے احقر کی شادی ہوئی تھی۔ امتحان دینے کے لئے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش ہوا، عبارت پڑھی، شاید عبارت میں کوئی غلطی بھی کی، پھر مضمون حدیث پر کوئی بحث نہیں کر سکا، خاموش بیٹھ گیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک سوال کیا۔ احقر یہی سمجھتا ہے کہ اُس کا جواب الٹا سیدھا دیا، مگر تعجب ہوا کہ احقر کو نمبر پورے عطا فرمائے۔ احقر کا خیال ہے کہ حضرت نے نمبر دیتے وقت وقتی صورتحال کا خیال نہیں فرمایا بلکہ نظر شفقت صلاحیت پر تھی اور اسی لحاظ سے نمبر عطا فرمائے۔ اسی قسم کا ایک دلچسپ واقعہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کے یہاں بھی

چند سال پہلے پیش آ چکا تھا۔

امتحانات میں نظر ''جواب'' پر نہیں ''محنت'' پر ہوتی تھی:

حضرت مولانا کے یہاں مقامات حریری کا درس ہوتا تھا۔ احقر کو اور مولانا اشفاق حسین صاحب سنبھلی کو مقامات سے اتنا شغف تھا کہ حافظ مقامات مشہور ہو گئے تھے۔ سہ ماہی امتحان کی نوبت آئی۔ امتحان تقریری تھا اور اتفاق سے احقر اور مولانا اشفاق صاحب دونوں کا امتحان ساتھ ہوا اور کچھ ایسی صورت ہوئی کہ اُس وقت درس گاہ میں ہم دو کے علاوہ اور کوئی طالب علم نہیں تھا۔ حضرت مولانا نے ساتویں مقامہ کی عبارت پڑھوائی اور نحوی سوال کیا جس کے جواب میں ہم دونوں قابل ترین طالب علم بغلیں جھانکنے لگے۔ حضرت مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا: ''مولانا! ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ مقامات خوب یاد کرتے ہیں، بڑی محنت کرتے ہیں''۔

حضرت مولانا کے اُن ملامتی ارشادات کے جواب میں ہم دونوں دم بخود تھے۔ یقین تھا کہ ہم دونوں فیل کر دیئے جائیں گے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں کو پورے نمبر عطا فرمائے۔ یہ بزرگانہ شفقت اس لئے تھی کہ ہماری محنت کا یقین تھا۔

اختلاف رائے کے باوجود مشفقانہ طرز یکساں رہا:

کتب درسیہ سے فارغ ہوا تو ملازمت کے سلسلہ میں بھی حضرت شاہ صاحب کی خاص شفقت نے دستگیری فرمائی۔

آرہ ضلع شاہ آباد صوبہ بہار میں ایک بہت پرانا مدرسہ ہے مدرسہ حنفیہ۔ اس نے گورنمنٹ سے ایڈ حاصل کرنی شروع کی اور مولوی فاضل وغیرہ کے درجات کھولے تو اُن کو ایسے مدرس کی ضرورت ہوئی جو ادب، تاریخ اور ہیئت وغیرہ کی کتابیں پڑھا سکے۔

حضرت شاہ صاحب کسی تقریب سے بہار تشریف لے گئے تو اراکین مدرسہ حنفیہ کے ایک وفد نے حضرت سے ملاقات کی اور مدرسہ حنفیہ کے لئے ''ادیب'' کی فرمائش کی۔ یہاں جس طرح استاذ محترم حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی عنایت خصوصی نے سبقت فرما کر احقر کا نام پیش کیا ایسے ہی حضرت شاہ صاحبؒ کی خاص شفقت تھی کہ باوجودیکہ نہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں کا حاضر باش تھا اور نہ اور کوئی خاص تعلق تھا۔ محض از راہ شفقت احقر کے نام کو منظور فرمایا۔

یہ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے۔ اُس وقت احقر کی عمر تقریباً بیس سال تھی، داڑھی نہیں تھی۔ صرف سبزہ آغاز تھا۔ مدرسہ حنفیہ کے عمر رسیدہ مدرسین اور اراکین کے لئے عجیب سی بات تھی کہ ایک لڑکے کو اس خدمت کے لئے بھیج دیا گیا، مگر ان بزرگوں کی دعاؤں نے امداد فرمائی اور چند اجتماع جو اسی ہفتہ میں ہوئے، اُن میں اردو، اور عربی کی تقریروں نے اس خلجان کو رفع کر دیا اور وہ بجائے تحقیر کے احقر کی عزت کرنے لگے، پھر تقریباً تین سال قیام میں ایسی مقبولیت حاصل ہوگئی کہ اگر وہاں کچھ اور عرصہ قیام رہتا تو شاید اس حلقہ کی معراج احقر کو حاصل ہو جاتی یعنی مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا پرنسپل بنا دیا جاتا مگر

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

انگریزی سرکار کی وظیفہ خواری کے ساتھ علم دین کی خدمت گوارا نہ ہوئی، گلو خلاصی کی کوشش کرنے لگا۔ ۱۹۲۹ء میں وہاں سے علیحدہ ہو کر جب مدرسہ شاہی مراد آباد میں تقرر ہوا تو اس موقع پر بھی ان دونوں بزرگوں کی شفقت کارفرما تھی۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نے کوشش فرمائی اور حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت شاندار الفاظ میں احقر کی سفارش فرمائی۔

اہتمام دارالعلوم سے وہ اختلاف جس کا اشارہ پہلے گذر چکا ہے، احقر کے دیوبند سے چلے جانے کے بعد رونما ہوا۔ عملی طور پر میں نے کسی پارٹی کی حمایت میں کچھ نہیں کیا، البتہ میرے رجحانات اہتمام کی حمایت میں تھے اور حضرت شاہ صاحبؒ کو اس کا علم تھا، مگر آرہ یا مراد آباد سے دیوبند حاضر ہو کر جب بھی خدمت اقدس میں حاضری ہوئی تو احقر نے حضرت کے مشفقانہ طرز میں کوئی فرق نہیں محسوس کیا۔

طریقہ اصلاح:

یہ سارا سلسلہ بیان حضرت میاں صاحب کا ہے، مزید تحریر فرماتے ہیں:

ایک بات اور یاد آ گئی۔ دیوبند کے طلبا اس زمانہ میں ساف باندھا کرتے تھے۔ یہ ساف ''گاڑھے'' گبرون یا ململ کے ہوتے تھے۔ بھاگلپوری سبز ساف خاص مقبولیت رکھتے تھے۔ احقر کے پاس ایک بناری ساف تھا، جس کے پلوں پر تقریباً چھ انگل سنہری کام تھا۔ ایک مرتبہ یہ ساف باندھے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ صاحبؒ کی نظر زرکار پلوں پر پڑ گئی، اثنائے گفتگو میں آپ نے مسئلہ بھی بیان فرما دیا کہ

''مرد کے لئے چار انگل سے زیادہ سنہری کام جائز نہیں ہے''۔

بیان کا پیرایہ اتنا لطیف تھا کہ اس وقت احقر کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ تنبیہ اور اصلاح مقصود ہے۔ حضرتؒ سے رخصت ہونے کے بعد غور کرتا رہا کہ اس مسئلہ کو گفتگو کے سیاق و سباق سے کیا تعلق ہے۔ بہت دیر بعد خود اپنے ساف کا خیال آیا اور پھر پلے کے کام کو ناپا تو چار انگل سے زائد تھا۔ اس کے بعد اس ساف کے زنانہ کپڑے بنوا دیئے گئے۔ طلبہ کے ساتھ لطف و کرم کی یہ چند مثالیں ہیں، جن کا تجربہ خود احقر کو ہوا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ (سیرت انور ص ۲۹۲ تا ۲۹۴)

طالب علم سے معافی مانگو :

مولانا سید احمد مالک کتب خانہ اعزازیہ دیوبند کا بیان کیا ہوا یہ واقعہ سننے کے قابل ہے۔ کہتے ہیں کہ جس سال ہماری بخاری و ترمذی حضرت شاہ صاحب کے یہاں زیر درس تھیں، دار العلوم دیوبند میں ایک عجیب مجہول شخصیت طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئی۔ یہ شخصیت پنجاب کی تھی۔ میلے کچیلے کپڑے چیتھڑا نما لباس، یہ طالب علم صرف درس میں نظر آتا۔ باقی تمام اوقات مطالعہ میں گذارتا۔ عصر سے مغرب تک اکثر طلبا تفریح کے لئے نکل جاتے مگر یہ کبھی تفریح میں نظر نہ آیا۔ مختی اور شوقین طلبا بھی کبھی اپنی ضروریات کے لئے بازار جاتے لیکن اسے دیوبند کے بازار میں نہیں دیکھا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ دار العلوم میں اجتماعات یا وقتی و ہنگامی جلسوں میں اس کی صورت نظر نہ پڑتی۔ میلے کچیلے کپڑے جن پر جوئیں گشت کرتی رہتی، طلبا اس کے قریب بیٹھنے یا اسے اپنے قریب بٹھانے سے گریز کرتے۔ اس کا معمول تھا کہ کھانے کے اوقات میں مٹی کا پیالہ لیے ہوئے مطبخ آتا، کھانا لینے کے بعد وہیں بیٹھ کر کھالیتا۔ اسی پیالہ کو لیے ہوئے مولسری کے کنویں پر پہنچتا، پیالہ کھنگال کر اسی میں پانی پی لیتا اور پھر بدستور داخل حجرہ۔ ایک آدھ مرتبہ اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو ایک بوریا اور ایک اینٹ جس سے یہ تکیہ کا کام لیتا، اس کے سوا کمرہ میں کوئی چیز نہیں تھی۔

میرے رفیق درس مولانا مفتی عتیق الرحمان نے ایک روز خلاف معمول اس طالب علم کو دیکھا کہ اپنی مخصوص نشست چھوڑ کر ہمارے ساتھ والی نشست پر آبیٹھا۔ پھٹا پرانا لباس اس پر چلتی ہوئی جوئیں اپنی کوفت سے زیادہ ہیو اور احساس تکلیف کا باعث بن رہا تھا کہ حضرت استاذ کو بھی اذیت ہوگی۔ حضرت شاہ صاحبؒ تشریف لا چکے تھے۔ آپ کی

تقریر روانی کے ساتھ جاری تھی۔ حافظ ابن تیمیہ، ابن حجر عسقلانی، ابن ہمام، بدر الدین عینی وغیرہ کے حوالے بلند پایہ تحقیقات اور ان پر رد و قدح کے دوران حضرت استاذ کی مسکراہٹ۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ آپ کی تمام تر توجہ اس وقت متعلقہ مسئلہ کی جانب ہے، نہایت ہی مخفی لہجہ میں اس طالب علم سے کہا کہ تمھیں شرم نہیں آتی، اتنے غلیظ ہو کر یہاں آبیٹھے ہو، میں مطمئن تھا کہ میری آواز حضرتؒ کے کان تک نہیں پہنچی ہوگی، گردن اٹھا کر دیکھا تو شاہ صاحبؒ کی کشادہ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور تقریر کا انبساط بھی رخصت ہو چکا تھا۔ سبق قبل از وقت ختم کیا اور درس گاہ سے رخصت ہوئے، مجھے اشارے سے بلایا، جب میں قیامگاہ پر پہنچا تو محسوس ہوا کہ آپ شدید ناگواری میں ہیں فرمایا مولوی صاحب! آپ بہت خفیف ہیں کہ ایک غریب طالب علم کی آپ نے دل شکنی فرمائی۔ یہ تواضع کے خلاف اور کبر کی علامت ہے۔ آپ کو کیا معلوم جس طالب علم کو آپ نے تنگ دست کہا وہ واحد طالب علم ہے جو میری تقریر کو مکمل سمجھ رہا ہے۔ جایئے اس سے معافی مانگئے۔ حضرت استاد کے اس حکم کی تعمیل کی گئی، لیکن یہ شبہ باقی رہا کہ حضرت نے اس طالب علم کے متعلق ایسے وقیع کلمات کس لئے استعمال کئے۔

ایک روز امتحان کی غرض سے اس طالب علم کے کمرہ میں پہنچ کر ایک اہم روایت کے متعلق سوال کیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب اس کی زبان سے حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر اس طرح سنی کہ الفاظ کی بھی تبدیلی نہ تھی۔ (نقش دوام ص ۹۵)

بھائی شمس الدین رخصت ہو رہے ہیں :

جناب مسعود احمد قاسمی صاحب لکھتے ہیں

حضرت شاہ صاحبؒ نے بڑی لطیف طبیعت پائی تھی اور ساتھ ہی مزاج کا عنصر

بھی موجود تھا۔ ایک دن عصر اور مغرب کے درمیانی وقت میں بخاری شریف کا درس دے رہے تھے کہ یکا یک کتاب بند کر دی اور کہا جب بھائی شمس الدین ہی چلے گئے تو اب سبق میں کیا لطف رہ گیا۔ چلو تم بھی اپنے گھر کا راستہ لو۔ سب لوگ حیران و پریشان رہ گئے کہ بھائی شمس الدین کون تھے اور وہ کب چلے گئے؟ جب حضرت شاہ صاحبؒ نے لوگوں کی حیرانی کو دیکھا تو غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے :

جاہلو ! دیکھتے نہیں وہ بھائی شمس الدین رخصت ہو رہے ہیں، اندھیرے میں سبق پڑھ کر کیا کرو گے۔ اس میں تو لطف نہیں آئے گا۔

دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس کی تنخواہ :

ایک مرتبہ ایک صاحب جو دیندار لوگوں میں سے تھے اور کلفیوں کا کاروبار کیا کرتے تھے، کلفیاں لے کر آئے محفل میں شاہ صاحبؒ کے علاوہ اور بھی بزرگ ہستیاں موجود تھیں، جب سب لوگ کلفیاں کھا چکے تو شاہ صاحبؒ نے اُن سے فرمایا : "بھئی آپ ان کلفیوں کی تجارت میں ایک مہینے میں کتنا پیدا کرتے ہیں"؟ انہوں نے جواب دیا" یہی کوئی ساٹھ روپے ماہانہ" اس پر شاہ صاحبؒ نے فرمایا" تو پھر تمہیں دارالعلوم کی صدر مدرسی کی ضرورت نہیں"۔ یہ بات شاہ صاحبؒ نے اس لئے فرمائی تھی کہ ان دنوں میں دارالعلوم کے صدر مدرس تھے اور اُن کی تنخواہ کل ساٹھ روپے ماہوار تھی۔

پیر نابالغ :

ایک دفعہ دوران درس میں نابالغ کی امامت کا مسئلہ چھڑ گیا کہ آیا نابالغ کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ شاہ صاحبؒ نے فرمایا، مسئلہ تو یہی ہے کہ نابالغ کے پیچھے نماز نہیں ہوتی لیکن بعض اوقات ہو جاتی ہے، پھر فرمانے لگے، کبھی تم نے ایسا بھی آدمی دیکھا ہے جو

بوڑھا بھی ہو اور پھر بھی نابالغ ہو؟ پھر خود ہی فرمانے لگے :

"پیر نابالغ میں ہوں کہ چالیس (۴۰) برس کی عمر ہونے کو آئی لیکن ابھی تک غیر شادی شدہ ہوں"۔ (سیرت انور ص ۲۷)

دسترخوان پر آئیے :

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رقمطراز ہیں :

کیمبل پور ضلع راولپنڈی کے سفر میں احقر مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ حال شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور اور دوسرے بعض اور مستفیدین بھی ساتھ تھے۔ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ بھی ہمراہ تھے۔ راولپنڈی پہنچے، بڑے بڑے اجتماعات ہوئے اور بڑی بڑی عالمانہ تقریریں ہوئیں۔ مجلسی خوش مذاقی اور ظرافت کے سلسلہ میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم وظیفہ پڑھ رہے تھے جو ناشتہ آ گیا۔ حضرت ممدوح نے زور سے فرمایا کہ : "شیخ وظیفہ کا مقصد آ چکا ہے دسترخوان پر آ جائیے"۔

اندر باہر فقیر :

کیمبل پور کے اسی سفر میں حضرت ممدوح نے مجھے "فقیر صاحب" کا خطاب عطا فرمایا۔ صورت واقعہ یہ ہوئی کہ بارش بہت زیادہ ہو گئی، جلسہ گاہ شہر سے میل بھر کے فاصلہ پر تھی، راستہ میں بھی بارش آ گئی۔ اور میں سر سے پیر تک پانی میں مع کپڑوں کے نچڑ گیا، جلسہ گاہ کے قریب ایک مسجد میں پہنچ کر بھیگے ہوئے کپڑے اُتارے، ایک صاحب نے اپنی چادر لنگی کے طور پر دی اور ایک صاحب نے اوڑھنے کے لئے دوسری چادر دیدی۔ میں لنگی باندھ کر اور چادر اوڑھ کر ننگے سر، ننگے پاؤں حضرت شاہ صاحب کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچا، حکم فرمایا کہ : "اس وقت جلسہ میں تقریر تجھی کو کرنا ہو گی"۔

چنانچہ مجھے اسٹیج پر کھڑا کر کے خود ہی میرے تعارف کی تقریر کی اور فرمایا کہ "یہ فقیر صاحب جو آپ کے سامنے حلہ میں ننگے سر ننگے پاؤں کھڑے ہیں فلاں ہیں، فلاں کے بیٹے اور فلاں کے پوتے ہیں علمی سواد خاسار رکھتے ہیں، مجمع میں بولنے کا ڈھنگ انہیں آ گیا ہے یہ جیسے باہر سے فقیر نظر آتے ہیں ویسے ہی اندر سے بھی فقیر صاحب ہی ہیں آپ ان کی تقریر سے فائدہ اُٹھائیں گے"۔ (سیرت انور ص ۱۱۹)

حکیمانہ تہدید یا مزاحی تنشیط :

حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب فرماتے ہیں :

ایک بار پچھلی صف میں سے کسی طالب نے سوال کیا، مگر مہمل انداز سے۔ فرمایا کہ "جاہل! تجھے معلوم نہیں کہ میں اسناد متصل کرنا بھی جانتا ہوں، جانتا ہے کس طرح اسناد متصل ہوگی؟ میں اس اپنے پاس والے کو تھپڑ ماروں گا، وہ اپنے والے کو مارے گا، وہ اپنے پاس والے تھپڑ رسید کرے گا، یہاں تک کہ تھپڑ کا یہ فعلی سلسلہ سند تجھ تک پہنچ جائے گا"۔

یہ تہدید بھی تھی اور حکیمانہ رنگ سے فنی اصطلاحات میں ایک مزاح بھی تھا، جس سے طلبہ کی تنشیط (نشاط میں لانا) مقصود تھی۔ (سیرت انور ص ۹۳)

چہدہ گز بہ بالا چہدہ گز بہ زیر :

ایک دفعہ فرمایا کہ ایک مغفل کھجور کے درخت پر چڑھ کر کھجوریں توڑنے لگا، جب اُترنے لگا تو طریقہ بھول گیا۔ ایک اور مغفل بھی آ گیا۔ اس نے رسہ طویل نیچے سے اس کی طرف پھینکا کہ اس کو اپنے بدن کے ساتھ باندھ لے میں تجھے نیچے کھینچ لوں گا، نیچے کھینچا تو بیچارہ گر کر مر گیا۔ لوگوں نے اسی کو پکڑا، یہ تو نے کیا کیا، بے چارے کی جان بھی گئی، جواب دیا کہ میں نے ایک دفعہ ایک شخص کو کنوئیں سے اسی طریق سے اوپر کھینچ لیا تھا۔ اسی پر قیاس

کر کے میں نے سمجھا — "چہدہ گز بہ بالا چہدہ گز بہ زیر" .... (انوار انوری ص ۶)

معروف تلامذہ :

ذیل میں ہم حضرت امام کشمیریؒ کے تلامذہ کی ایک مختصر اور نا تمام فہرست پیش کرتے ہیں۔ یہ فہرست نا تمام ہے اور بہت سے چیدہ چیدہ علماء اور صلحاء کے نام ہم نے بخوف طوالت نظر انداز کر دئے ہیں۔

(۱) شیخ الاسلام حضرت مولانا فخر الدین احمد شیخ الحدیث مرکز علوم اسلامیہ دار العلوم دیوبند (دورۂ حدیث شریف آپ نے اگرچہ شیخ الہند علیہ الرحمۃ سے پڑھا ہے، لیکن حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ سے بھی اتنا زیادہ علمی استفادہ کیا ہے کہ آپ کے تلامذہ کی صف میں سب سے اول نمبر پر آپ کا شمار کیا جاتا ہے۔

(۲) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند۔

(۳) حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

(۴) مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم عمومی جمعیۃ العلمائے ہند دہلی۔

(۵) حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی ناظم اعلی ندوۃ المصنفین دہلی۔

(۶) شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب متو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ۔

(۷) حضرت مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکی قدس سرہ العزیز افریقہ۔

(۸) حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ مہاجر مدنی مؤلف فیض الباری۔

(۹) حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ سابق صدر دینیات حیدر آباد عثمانیہ یونیورسٹی و مؤلف سوانح قاسمی۔

(۱۰) حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ صدر جامعہ اشرفیہ لاہور پاکستان۔

(۱۱) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ دیوبندی مفتی اعظم پاکستان۔

(۱۲) حضرت مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم نجیب آبادی، مؤلف انوار المحمود۔

(۱۳) حضرت مولانا قاضی سجاد حسین صاحبؒ صدر المدرسین مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی

(۱۴) حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ اکبر آبادی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

(۱۵) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ، دار العلوم الاسلامیہ کراچی۔

(۱۶) حضرت مولانا محمد ادریس صاحبؒ سکروڈویؒ سابق مدرس جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت۔

(۱۷) حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ دیوبندی ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی۔

(۱۸) حضرت مولانا محمد چراغ صاحبؒ گوجرانوالہ۔

(۱۹) حضرت مولانا احسان اللہ خان صاحبؒ تاجورؒ لاہور۔

(۲۰) حضرت مولانا مصطفیٰ حسن علویؒ پروفیسر یونیورسٹی مولوی گنج لکھنؤ۔

(۲۱) حضرت مولانا میرک شاہ صاحب کاشمیریؒ سابق پروفیسر اورینٹل کالج لاہور۔

(۲۲) حضرت مولانا محمد نعیم صاحبؒ لدھیانوی۔

(۲۳) حضرت مولانا حبیب الرحمٰنؒ صاحب لدھیانوی۔

(۲۴) حضرت مولانا حمید الدین صاحبؒ شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ۔

(۲۵) حضرت مولانا مفتی محمود احمد صاحبؒ نانوتوی رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند۔

(۲۶) حضرت مولانا حامد الانصاریؒ غازی رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند۔

(۲۷) حضرت مولانا منظور احمد صاحبؒ نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ۔

(۲۸) حضرت مولانا سلطان محمود صاحبؒ سرحدی سابق صدر مدرس مدرسہ فتح پوری دہلی

(۲۹) حضرت مولانا محمد اسماعیل سنبھلی، سنبھل (مراد آباد)

(۳۰) حضرت مولانا محمد تقی صاحبؒ دیوبندی۔

(۳۱) حضرت مولانا محمد ادریس صاحبؒ میرٹھی۔

(۳۲) حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحبؒ سجاد میرٹھی۔

(۳۳) حضرت مولانا محمد صاحب انوریؒ مدرسہ تعلیم الاسلام سنت پورہ لائل پور پاکستان

(۳۴) حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ صاحب۔

(۳۵) حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب کامل پوریؒ محدث حضرو ضلع کیمبلپور۔

(۳۶) حضرت مولانا شائق احمد صاحبؒ ایڈیٹر عصر جدید کراچی۔

(۳۷) حضرت مولانا قاری اصغر علی صاحبؒ مدرس دار العلوم دیوبند۔

(۳۸) حضرت مولانا عبد الحق صاحبؒ نافع سابق استاد دار العلوم دیوبند۔

(۳۹) حضرت مولانا عبد الوہابؒ صاحب مہتمم مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام۔

(۴۰) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام۔

(۴۱) حضرت مولانا محمد طاہر القاسمیؒ سابق ناظم دار الصنائع دار العلوم دیوبند۔

(۴۲) حضرت مولانا محمد یوسفؒ صاحب میر واعظ کشمیر اصغر مال روڈ راولپنڈی پاکستان

(۴۳) حضرت مولانا سید اختر حسینؒ صاحب مدرس دار العلوم دیوبند۔

(۴۴) حضرت مولانا یعقوب الرحمٰن صاحبؒ عثمانی سابق ناظم جمعیۃ الطلبہ دار العلوم دیوبند۔

(۴۵) حضرت مولانا فیوض الرحمٰن صاحب مرحوم پروفیسر اورینٹل کالج لاہور۔

(۴۶) حضرت مولانا عبدالحنان صاحبؒ ہزاروی جامع مسجد صدر راولپنڈی۔

(۴۷) حضرت مولانا مفتی فیض اللہ صاحبؒ ہاٹ ہزاری چاٹگام۔

(۴۸) حضرت مولانا اسماعیل یوسف گارڈویؒ جوہانسبرگ (ٹرانسوال) جنوبی افریقہ۔

(۴۹) مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ فتح پوریؒ۔

(۵۰) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سرگودھا۔

(۵۱) مولانا جمیل الدین صاحب میرٹھیؒ جامعہ اسلامیہ بہاولپور۔

(۵۲) حضرت مولانا محمد ایوب صاحبؒ اعظمی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت۔

(۵۳) حضرت مولانا احمد اشرف صاحبؒ جامعہ اشرفیہ راندیر ضلع سورت۔

(۵۴) مولانا انوار الحق صاحب اعظمی مرحوم۔

(۵۵) مولانا عبدالعزیز صاحبؒ بہاری سابق صدر جمعیۃ علماء بمبئی۔

(۵۶) حضرت مولانا سید نثار احمد صاحبؒ توری الہریا سرائے ضلع دربھنگہ۔

(۵۷) مولانا اسلام الحق صاحب اعظمی استاذ دارالعلوم دیوبند۔

(۵۸) حضرت مولانا ظہور احمد صاحب دیوبندیؒ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند۔

(۵۹) مولانا محمد جلیل صاحب کیرانویؒ، استاذ دارالعلوم دیوبند۔

(۶۰) حضرت مولانا حکیم سید محفوظ علی صاحب مرحوم دیوبند۔

(۶۱) مولانا حکیم محبوب الرحمٰن صاحبؒ بجنور۔

(۶۲) مولانا سید احمد رضا صاحب مؤلف انوار الباری بجنور۔

(۶۳) مولانا محمد امین صاحبؒ استاذ حدیث دارالعلوم مئو، اعظم گڑھ۔

(۶۴) مولانا ریاست علی صاحبؒ، جبل پور۔

(۶۵) مولانا غلام مصطفی صاحب کشمیریؒ سابق ایم این اے کشمیر۔

(۶۶) مولانا عبدالکبیر صاحب جامعہ مدینۃ العلوم حضرت بل سری نگر۔

(۶۷) مولانا آل حسن صاحبؒ دیوبندی مقیم میرٹھ۔

(۶۸) مولانا بشیر احمد صاحبؒ مدرسہ مظہر العلوم کرتپور ضلع بجنور۔

(۶۹) مولانا ابو احمد عبداللہ صاحبؒ لدھیانوی دارالعلوم نعمانیہ گوجرانوالہ۔

(۷۰) شیخ التفسیر مولانا غلام اللہ خان صاحبؒ راولپنڈی۔

(۷۱) مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاریؒ گجرات پاکستان

(۷۲) حضرت مولانا سیف اللہ شاہ صاحبؒ لولاب کشمیر۔

(۷۳) مولانا عبدالوحید صاحبؒ پرتاپ گڈھ (یو۔ پی)

(۷۴) مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(۷۵) حضرت مولانا حکیم سعد اللہ صاحبؒ ناظم دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ۔

(۷۶) حضرت مولانا محمد صادق صاحبؒ صدر مدرس بڑودہ گجرات۔

(۷۷) مولانا نعمت اللہ صاحب انوریؒ، بیر بھوم ضلع اسکول سوری ضلع بیر بھوم۔

(۷۸) مولانا مفتی اسماعیل بسم اللہ مرحوم ڈابھیل ضلع سورت۔

(۷۹) مولانا محمود احمد صاحبؒ ضلع دربھنگہ (بہار)

(۸۰) مولانا حکیم عبدالاول صاحبؒ اجراڑہ ضلع میرٹھ۔

(۸۱) مولانا افتخار علی صاحب خیر نگر بازار میرٹھ۔

(۸۲) مولانا عبداللہ خان صاحبؒ کرتپوری ہمدرد دواخانہ دہلی۔

(۸۳) مولانا اسماعیل کاچھوی صاحب مرحوم جوہانسبرگ جنوبی افریقہ۔

(۸۴) مولانا ایم آئی ناناصاحبؒ جوہانسبرگ جنوبی افریقہ۔

(۸۵) مولانا صالح ابن محمد منگیرا جوہانسبرگ جنوبی افریقہ۔

حضرت امام کشمیریؒ زندگی بھر علوم دینیہ خصوصاً حدیث رسول ﷺ کی تدریس و ترویج میں مشغول رہے۔ ان کا علمی فیضان دور دور تک پہنچا۔ ہزاروں طالبان علوم نبوت ان کے درس سے فیض یاب ہو کر دنیا کے کونے کونے میں پہنچے..........

چمن میں حسن گل و لالہ دیکھنے والو!
گلوں میں عکس رخ باغباں بھی ہوتا ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆

باب : ۴

محدث شانہ جلالتِ قدر، تدریسی خصوصیات، تجدیدی کارنامے، محققانہ مباحث، مجتہدانہ افاضات اور درسی معارف وافادات

دارالعلوم دیوبند کی داغ بیل اُن علمائے ربانیین نے ڈالی تھی جو سراپا خلوص و للّٰہیت تھے۔ان کا دل و دماغ ملتِ اسلامیہ کے شاندار مستقبل کے لئے بے چین تھا۔ انہوں نے اپنے کو اشاعتِ دین اور ترویجِ علوم دینیہ کے لئے وقف کر دیا تھا اور بانیانِ دارالعلوم کچھ زیادہ سن رسیدہ اور معمر نہ تھے بلکہ ان کا تعلق عمر کے اس دور سے تھا جسے دورِ شباب کہا جاتا ہے نوجوانوں کے لئے یہ بات بڑی سبق آموز ہے، اس سے ''بزرگی بعقل است نہ بسال'' کی جہاں تصدیق ہوتی ہے وہاں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ مردانِ کار کسی بڑے کام کے لئے اپنے کُہن سال اور معمر ہونے کا انتظار نہیں کرتے، بلند ہمتی ماہ وسال کی پابند نہیں ہوا کرتی۔

دارالعلوم سے ہزاروں علماء،صوفیا،اتقیاء،صلحاء،محدثین، مصنفین اور مبلغین پیدا ہوئے جنہوں نے دنیا کے کونے کونے میں اسلام کی ترویج و اشاعت کے لئے بے مثال قربانیاں پیش کیں۔

دارالعلوم دیوبند میں آغازِ تدریس :

محدث کبیر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ بھی دارالعلوم کے ابتدائی دور کے تلامذہ میں سے ہیں۔ جب آپ دارالعلوم سے فارغ ہوئے تو کچھ عرصہ مدرسہ امینیہ میں پڑھاتے رہے، پھر کشمیر چلے گئے۔ وہاں ''مدرسہ فیضِ عام'' کے نام سے ایک دینی مدرسہ

قائم کیا، کچھ وقت کے بعد حج کی سعادت سے بہرہ مند ہونے کے لئے سفر حجاز کا ارادہ کیا، وہاں سے واپسی پر دیوبند تشریف لائے اپنے اساتذہ کرام خصوصاً حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت وملاقات کا شرف حاصل کیا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا، اب آپ کو دارالعلوم میں تدریس کرنی ہے۔ کافی عرصہ تک بلا تنخواہ تدریس کرتے رہے، جب شادی ہوئی تو طوعاً و کرہاً تنخواہ قبول کی۔

صدارتِ تدریس :

جب مصر کے مشہور زمانہ عالم سید رشید رضا دیوبند تشریف لائے اور حضرت شاہ صاحبؒ سے ان کی ملاقات ہوئی تو بے ساختہ بار بار یہ کہتے تھے کہ میں نے اس جلیل القدر استاد جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے بعد دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس کا عہدہ جلیلہ آپ ہی کے سپرد ہوا۔ آپ کی شخصیت پر علم حدیث کا ذوق غالب تھا۔ صحاح ستہ کے علاوہ حدیث کی اکثر کتابیں بر نوک زبان تھیں۔

درسِ انور کا ایک منظر :

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ آپ کے تلامذہ میں سے ہیں، وہ اپنی کتاب ''دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' میں اپنی یادداشتیں اور حضرت شاہ صاحبؒ کے انداز تدریس کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

بہر حال یوں ہی اب صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ ہفتہ یا ہفتہ سے زیادہ دن گزرے کہ درس کا اعلان ہوا۔ معلوم ہوا کہ کل سے دورہ کے اسباق شروع ہوں گے۔ کتابیں جن کے اسباق شروع ہونے والے تھے، کتب خانہ سے برآمد کرلی گئیں تھیں، صبح کی نماز کے بعد ہی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے حضرت سیدنا الامام الکشمیریؒ کے یہاں صحیح مسلم کا سبق

شروع ہوگا۔ طلبا کا ہجوم تھا، انہی کے جھمیلے میں خاکسار بھی نودرہ کی چھت کے شمالی سمت پر جو ایک کمرہ تھا، اس میں حاضر ہوگیا، اتنی بڑی تعداد والی جماعت میں شریک ہو کر بیٹھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ خیال آتا ہے کہ صحیح مسلم کا اتفاقاً وہی نسخہ مجھے کتب خانہ سے ملا تھا جو طول و عرض میں حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں غیر معمولی طور پر ممتاز تھا لیکن کرتا کیا، اسی طویل و عریض کتاب کو لے کر کوٹھے پر چڑھ گیا، درس کے کمرے میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھی ہوئی تھیں، طالب علموں نے انہیں تپائیوں پر قبضہ کرلیا، ایک تپائی میرے حصہ میں بھی آئی۔

علم کا بحرِ بیکراں :

خیال تھا کہ جیسے عام طور پر ہمارے مدارس کا دستور ہے، طلبا کتاب کی عبارت پڑھیں گے اور حضرت شاہ صاحب پھر اس عبارت کا مطلب بتائیں گے۔ لیکن پہلی مرتبہ درس کے ایک نئے طریقے کے تجربہ کا موقع میرے لئے یہ تھا کہ بسم اللہ بھی کتاب کی شروع نہیں ہوئی تھی کہ علم کا ایک بحر بیکراں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرے دل و دماغ کے ساحلوں سے ٹکرانے لگا۔ ایسے اساتذہ (غفر اللہ لھم) سے پڑھنے کا موقع ملا تھا، جو کتاب کو شروع کراتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس قسم کی عام باتوں کا تذکرہ عموماً کیا کرتے ہیں کہ مصنف نے خدا کی حمد سے کتاب کیوں شروع کی اور اسی عام سوال کو اٹھا کر، اس کا جو مقررہ جواب کتابوں میں لکھا ہے، لفظوں کے الٹ پھیر سے دہرانے کے عادی تھے، صلوۃ کی شرح، مختلف امور کی طرف اس لفظ کا انتساب اس کے معانی میں کن تبدیلیوں کو پیدا کرتا ہے۔

الغرض مسلمان مصنفوں کی کتابوں کے دیباچہ کے عمومی اجزاء کے متعلق سوال و

جواب، رد وقدح کا موروثی سرمایہ، حواشی وشروح میں جو منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، اسی کو غریب طالبعلموں پر پیش کرکے اپنی علمی وسعت کو ظاہر کرتے تھے، لیکن الامام الکشمیریؒ نے قبل اس کے کہ کتاب کا کوئی لفظ بھی شروع ہوا ہو، ایک خاص قسم کی دلکش ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی، کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا تقریباً چالیس سال کے بعد اس کا دہرانا آسان نہیں ہے لیکن بعض انقلابی تاثرات کا نشان حافظہ پر جہاں تک خیال کرتا ہوں اب بھی باقی ہے پہلے ہی سبق میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونے والے معلومات ایکایک میرے سامنے آگئے۔

اندازِ تدریس :

حضرت شاہ صاحبؒ فطرتاً ادیب تھے، اس لئے اردو زبان جو ان کی مادری زبان نہ تھی چاہتے تو اس زبان کے بہترین ادیب وخطیب کی شکل میں اپنے آپ کو نمایاں کرسکتے تھے، لیکن مسلسل عربی کتابوں کے مطالعہ سے اور ادب عربی کی دوامی مزاولت کا اثر تھا کہ زبان مبارک پر عربی زبان کے الفاظ زیادہ چڑھ گئے تھے بلکہ طریقہ بیان بھی آپ کا عربی طرز بیان سے زیادہ متاثر تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ گو تعلیمی وتدریسی زبان آپ کی اردو تھی لیکن عربی زبان کے ایسے الفاظ جو اردو میں عموماً مستعمل نہیں ہیں، اضطراراً آپ کی زبان مبارک سے مسلسل نکلتے رہتے تھے۔

تواتر کے اقسام چہارگانہ کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زبان مبارک سے پہلی دفعہ میں نے طبقة بعد طبقة کے عام الفاظ کے ساتھ جيلًا بعد جيلٍ کے الفاظ سنے تھے۔ اس کی غرابت کا احساس اب بھی میرے حافظہ میں زندہ ہے۔ شاید اسی موقع پر "الكافة عن الكافة" یا "الكواف عن الكواف" ابن حزم کی مخصوص اصطلاح بھی سننے میں آئی۔

اسی قسم کے غیر مشہور یا اردو زبان میں جو الفاظ عربی کے مروج نہ تھے، اُن کے استعمال کرنے کی غرض ممکن ہے کہ یہ بھی ہو کہ عام مسلمانوں کو نہ سہی لیکن عربی مدارس کے طلباء کا ان الفاظ سے مانوس ہونا، ان کی شان کے مناسب تھا اور شاہ صاحبؒ شاید اس طریقے سے طلباء کو ان عالمانہ اصطلاحات وتعبیرات سے مانوس بنانا بھی چاہتے تھے۔

بعض غریب اصطلاحات کا تعارف واستعمال :

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ شاہ صاحب نے ان غریب اصطلاحات کے استعمال کی توجیہ کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ بعض چیزیں دنیا میں ایسی ہیں جن کا ذکر کنائے اور اشارے ہی میں کرنا، عام انسانی تہذیب کا اقتضاء ہے، پھر یہ نکتہ بھی ان ہی سے سننے میں آیا اور بالکل صحیح بات تھی کہ تراشنے والے ان چیزوں کی تعبیر کے لئے اچھے اچھے الفاظ تراش لیتے ہیں "پائین خانہ" مکان کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں، پھر اس سے بیت الخلاء مراد لینے لگے، لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ پائخانہ کی شکل اختیار کرکے خود گندہ ہوگیا، فرماتے تھے کہ معانی کی گندگی رفتہ رفتہ الفاظ تک منتقل ہوکر پہنچ جاتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ تھوڑے تھوڑے دن بعد اس قسم کے الفاظ پر نظرثانی کی جائے۔

اپنے اسی خیال کے مطابق عورتوں کے ایام کی تعبیر وہ ہمیشہ "ایام طمث" استعمال کرنے کے عادی تھے، کیونکہ "حیض" کا لفظ حالانکہ خود کنائی تعبیر ہے لیکن کثرت استعمال نے اس کو بھی اس قابل نہیں رکھا کہ مہذب مجلسوں میں اس کے استعمال کو جاری رکھا جائے۔

گھر کی باتیں :

خیر قصہ تو حضرت شاہ صاحب کے درسی خصوصیات کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ باتوں

باتوں میں صرف حدیث ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم کے ایسے اہم اہم کلیات، ہاتھوں ہاتھ ان کے درس میں آجاتے تھے کہ اپنے ذاتی مطالعہ سے شاید ساری عمر ان تک رسائی ہم جیسے نارساؤں کی آسان نہ تھی۔

حدیث کے متعلق تواتر کے اقسام چہارگانہ کے سوا اصول حدیث کے "الاعتبار" کے اصطلاح کی شرح کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے جو تقریر فرمائی تھی حالانکہ تقریباً نصف صدی کے قریب زمانہ گزر چکا ہے لیکن وساوس وشبہات، شکوک واوہام کی جو تاریکیاں اچانک میرے سامنے سے چھٹ گئی تھیں اور سکینت وطمانیت کی جو لذت اس وقت میسر آئی تھی، دل میں اس کی خنکی اور حلاوت اس وقت تک موجود ہے۔ ایک ہی حدیث کے متعلق اعتبار کے قاعدے سے اعتماد اور بھروسہ کی جو منطقی قوت فراہم ہوتی ہے' صحیح طور پر اس قوت سے واقف ہو جانے کے بعد اپنی جبلت سے آدمی اس اعتماد کی کیفیت کے نکالنے سے عاجز ہو جاتا ہے، جو قدرةً اس عمل کے بعد دلوں میں حدیث کے متعلق پیدا ہو جاتا ہے ۔حدیث کے متعلق شاہ صاحبؒ کے درس میں گر کی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ ایسی باتیں جن سے تاثرات میں غیر معمولی انقلاب پیدا ہو جاتا تھا۔

آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کا لکچر ہال :

یاد آتا ہے ایک دفعہ مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خان جو کسی زمانہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کالج کے روح رواں جزوکل یا کم از کم غیر معمولی مؤثر عنصر تھے۔ صاحبزادے صاحب مرحوم کبھی کبھی دیوبند تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ صحیح مسلم کے درس میں آکر وہ بھی شریک ہوئے، واپس ہو کر میں نے خود ان سے سنا ہے کہتے تھے کہ آج تو آکسفورڈ اور کیمبرج کے لکچر ہال کا منظر میرے سامنے آگیا تھا۔ یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں

پروفیسر کو جیسے پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا ہے، آج ہندوستان میں میری آنکھوں نے اسی تماشے کو دیکھا۔

معلومات کا تلاطم پذیر طوفان :

یادداشت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ معلومات کا طوفان شاہ صاحب کے اندر تلاطم پذیر رہتا تھا۔ خیال آتا ہے کہ کسی مسئلہ پر تقریر فرماتے ہوئے اسی کی مناسبت سے، ان کا ذہن کسی دوسرے مسئلہ کی طرف منتقل ہو جاتا، تو عموماً فرماتے "مجھے دفاع ہو گیا اس مسئلہ کی طرف" ان دفاعی مسائل میں صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع وغیرہ فنون تک کے مسائل شریک تھے۔

سیبویہ کی الکتاب :

عربیت سے تعلق رکھنے والے ان علوم سے شاہ صاحب کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ان علوم کی اعلیٰ بنیادی کتابوں کا غیر معمولی فکر ونظر کے ساتھ انہوں نے مطالعہ کیا تھا، میرا خیال ہے کہ کافیہ اور شرح جامی کے ساتھ مدارس کے عام مولویوں کا جو تعلق ہوتا ہے، یہی تعلق شاہ صاحب کو سیبویہ کی الکتاب سے تھا۔ ابن عصفور جس کے کچھ نوٹ اور کچھ حواشی سیبویہ کی کتاب پر ہیں، اس نام کو بھی پہلی دفعہ خاکسار نے شاہ صاحب ہی سے سنا تھا اور کہہ سکتا ہوں کہ ان کے بعد پھر کسی مولوی کی زبان سے یہ الفاظ سننے میں نہ آئے۔ دوسروں کی کیا کہوں، سیبویہ کی الکتاب کے مطبوعہ نسخے پر میری نظر تو ضرور پڑی ہے، شاید ادھر ادھر سے کچھ اس کو دیکھا اور پڑھا بھی ہوگا، لیکن ابن عصفور کے حاشیے کے دیکھنے کا بھی شرف حاصل نہ ہوا۔ معانی وبیان وبدیع کے مسائل میں الجرجانی کی دلائل الاعجاز، اسرار البلاغت یا زمخشری کی تفصیل کے سوا تفتازانی وغیرہ مصنفوں کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے شاہ

صاحب کو فقیہ نے کبھی نہیں دیکھا۔

فقہی معیار :

اصول فقہ میں وہ ابن ہمام کی تحریر کے گویا حافظ تھے۔ فقہ میں ابوبکر کاسانی صاحب بدائع شمس الائمہ سرخسی اور ابن نجیم صاحب بحر الرائق سے ان کو بہت متاثر پاتا تھا۔ شامی کے تفقہ پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ چنداں بھروسہ نہیں۔ صاحب ہدایہ کے بڑے مداح تھے۔ عموماً فرماتے کہ ابن ہمام کی فتح القدیر جیسی کتاب لکھنے کا ارادہ کروں تو کر سکتا ہوں لیکن ہدایہ جیسی کتاب کے لکھنے سے اپنے کو قطعاً عاجز پاتا ہوں۔

([illegible] دارالعلوم میں چھپے ہوئے درس ص [illegible])

تدریس حدیث میں تجدیدی کارنامہ :

حضرت مولانا عبدالحلیم چشتی فاضل دیوبند حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث کی تصویر یوں دکھاتے ہیں :

حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ درس حدیث میں صرف کتاب نہیں پڑھاتے بلکہ صحیح معنوں میں علوم حدیث کا درس دیتے ہیں، جس سے طلبہ کے ذہن میں جلاء، نظر میں وسعت اور معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا تھا اور انہیں اپنی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لینے کا ڈھنگ آتا تھا۔ درس حدیث میں علامہ موصوف کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کی شرح میں ہر فن کا اجراء کیا اور تمام متداول علوم وفنون کو حدیث کی شرح میں برتا اور ان کے اجراء کا طریقہ اور سلیقہ سکھایا ہے۔

درس حدیث میں تنوع :

علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ نے درس حدیث میں مشکلات علوم کو حل کیا ہے اور فن کی

دقیق باتوں کو سمجھایا ہے۔ ان وجوہ کی بنیاد پر ان کے درس کی تقریروں (امالی) میں جو تنوع پایا جاتا ہے، وہ امالی کی علمی دنیا میں اور کہیں نہیں ملتا۔

امام کشمیریؒ کی امالی کو قید تحریر میں لانے کے لئے موزوں ترین شخصیت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تھی، وہ بڑے ذہین اور علوم معقول ومنقول میں حاذق تھے۔ عربی تحریر وتقریر میں پوری قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں جگہ جگہ ائمہ فن اور کبار علماء کے اقوال کے ساتھ ساتھ علامہ محمد انور شاہؒ کے اقوال کو بھی زیب قرطاس کیا ہے۔

علامہ محمد انور شاہؒ کی امالی اگرچہ پوری صحاح ستہ پر ہیں لیکن العرف الشذی علی جامع الترمذی ، فیض الباری علی صحیح البخاری اور معارف السنن زیادہ اہم ہیں۔ ([illegible])

درس حدیث کی امتیازی خصوصیات :

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ لکھتے ہیں :

حضرت شاہ صاحبؒ کے درس حدیث میں کچھ ایسی امتیازی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے درسوں میں نہ تھیں اور حضرت شاہ صاحبؒ کا انداز درس درحقیقت دنیائے درس وتدریس میں ایک انقلاب کا باعث ثابت ہوا۔

اولاً آپ کے درس حدیث میں رنگ تحدیث غالب تھا۔ فقہ حنفی کی خدمت وتائید وترجیح بلاشبہ ان کی زندگی تھی، لیکن رنگ محدثانہ تھا۔ فقہی مسائل میں کافی سیر حاصل بحث فرماتے، لیکن انداز بیان سے یہ کبھی مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ آپ حدیث کو فقہی مسائل کے تابع کر رہے ہیں اور کھینچ تان کر حدیث کو فقہ حنفی کی تائید میں لانا چاہتے ہیں، بھلا اس کا قصد وارادہ تو کیا ہوتا؟ بلکہ واضح یہ ہوتا تھا کہ آپ فقہ کو بحکم حدیث قبول کر رہے ہیں۔ حدیث فقہ کی طرف نہیں لے جائی جا رہی ہے بلکہ فقہ حدیث کی طرف لایا جا رہا ہے، وہ آ رہا ہے اور

کلیۃً حدیث کے موافق پڑتا جارہا ہے۔ بالفاظ دیگر گویا حدیث کا سارا ذخیرہ فقہ حنفی کو اپنے اندر سے نکال کر پیش کر رہا ہے اور اُسے پیدا کرنے کے لئے نمودار ہوا ہے۔

درس میں محدثانہ رنگ غالب رہتا :

درس حدیث میں آپ کے یہاں محدثانہ رنگ غالب تھا اور حدیث کو فقہ حنفی سے مؤید کی حیثیت سے نہیں بلکہ اُس کے منشا کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا اور ہاتھ در ہاتھ اُس کے دلائل وشواہد سے اس دعویٰ کو مضبوط بنایا جاتا تھا۔

متون حدیث کی معتمد کتابوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر الحدیث بالحدیث کے اُصول پر کسی حدیث کے مفہوم کے بارہ میں جو دعویٰ کرتے اُسے دوسری احادیث سے مؤید اور مضبوط کرنے کے لئے درس ہی میں کتب پر کتب کھول کر دکھائے جاتے تھے۔ اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متعین ہوجاتا تھا تو نتیجتاً وہی فقہ حنفی کا مسئلہ نکلتا تھا۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ حدیث فقہ حنفی کو پیدا کر رہی ہے۔ یہ ہرگز مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ فقہ حنفی کی تائید میں خواہ مخواہ توڑ مروڑ کر حدیثوں کو پیش کیا جارہا ہے یعنی گویا اصل تو مذہب حنفی ہے۔ محض مؤیدات کے طور پر روایات حدیث سے اُسے مضبوط بنانے کے لئے یہ ساری جدوجہد کی جارہی ہے۔ نہیں، بلکہ یہ کہ حدیث اصل ہے لیکن جب بھی اُس کے مفہوم کو اُس کے قوی اور سیاق وسباق نیز دوسری احادیث باب کی تائید ومدد سے اُسے مشخص کر دیا جائے تو اس میں سے فقہ حنفی نکلتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔

تلامذہ کے تأثرات :

اس لئے طلبائے حدیث حضرت ممدوح کے درس سے یہ ذوق لے کر اٹھتے تھے

کہ ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حقیقتاً حدیث پر عمل کر رہے ہیں اور حدیث کا جو مفہوم ابوحنیفہؒ نے سمجھا ہے وہی درحقیقت شارع علیہ السلام کا منشا ہے۔ جس کو روایت حدیث ادا کر رہی ہے بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس روایت حدیث سے امام ابوحنیفہؒ اپنا کوئی مفہوم پیش نہیں کرتے بلکہ صرف پیغمبر علیہ السلام کا مفہوم پیش کر رہے ہیں اور خود اس حدیث میں محض ایک جویا اور ناقل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہمہ جہتی محققانہ مباحث :

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کے بحر ذخار ہونے کی وجہ سے درس حدیث صرف علوم حدیث ہی تک محدود نہ رہتا تھا، اس میں اعلیٰ وادالطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم وفن کی بحث آتی تھی، اگر معانی وبلاغت کی بحث آجاتی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم ومعانی کا یہ مسئلہ اسی حدیث کے لئے واضع نے وضع کیا تھا معقولات کی بحثیں آجاتیں اور معقولیوں کے کسی مسئلہ کا رد فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ حدیث گویا معقولات کے مسئلہ ہی کی تردید کے لئے قلب نبوی پر وارد ہوئی تھی۔

غرض اس نقلی اور روایتی فن (حدیث) میں نقل وعقل دونوں کی بحثیں آتیں اور ہر فن کے متعلق مقصد پر ایسی سیر حاصل اور محققانہ بحث ہوتی کہ علاوہ بحث حدیث کے وہ فنی مسئلہ ہی فی نفسہ اپنی پوری تحقیق کے ساتھ منقح ہوکر سامنے آجاتا تھا۔

سال بھر تک یکسانی کے ساتھ مسائل پر یہ محققانہ بحثیں جاری رہتیں۔ یہ ضرور تھا کہ ششماہی امتحان کے بعد عصر سے مغرب تک کا وقت طلبہ کا مزید لے لیتے تھے، جس سے رجب کے اواخر تک یعنی امتحان سالانہ شروع ہونے سے پہلے پہلے ترمذی وبخاری یکساں شان تحقیق کے ساتھ ختم ہوجاتی تھیں۔

بہر حال حضرت شاہ صاحبؒ کا درس حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی اور سائنس وغیرہ تمام علوم جدیدہ وقدیمہ پر مشتمل ہوتا تھا اور اس لئے اس جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم وفن کا مذاق لے کر اٹھتا تھا اور اس میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ بخشن کلام خدا ورسول ہر فن میں محققانہ انداز سے کلام کر جائے۔

درسی لائن کا انقلاب :

یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر الاستاذ الامام الکشمیریؒ نے اختیار فرمایا۔ چنانچہ کبھی کبھی تحدیث بالنعمة کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ ''بھائی اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہو سکا ہم نے سامان جمع کر دیا ہے''۔ بالخصوص فقہ حنفی کے مآخذ ومناشی کے سلسلہ میں حدیثی ذخیرہ کافی ہی نہیں کافی سے زائد جمع فرما دیا۔

عمر بھر کا نچوڑ :

پھر بھی قیام ڈابھیل کے زمانہ میں آخری سال جس کے بعد پھر درس دینے کی نوبت نہیں آئی اور وصال ہو گیا۔ درس حدیث میں فقہی وحدیثی تحقیقات کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا اور ترجیح مذہب حنفی اور تطبیق روایات میں عمر بھر کے علم کا نچوڑ پیش فرمایا، جس کو املا کرنے والوں نے املا کیا۔

''تائید مذہب حنفی'' کے اس غیر معمولی اہتمام کی توجیہ کرتے ہوئے گاہ گاہ فرماتے کہ عمر بھر ابوحنیفہؒ کی نمک حرامی کی ہے۔ اب مرتے وقت جی نہیں چاہتا کہ اس پر قائم رہوں۔ چنانچہ کھل کر پھر ترجیح مذہب کے سلسلہ میں اچھوتے اور نادر ذخائر علوم ومعارف

اور نکات ولطائف ارشاد فرماتے، جس سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ منجانب اللہ آپ پر مذہب حنفی کی بنیادیں منکشف ہو گئی تھیں اور اُن میں شرح صدر کی کیفیات پیدا ہو چکی تھیں، جس کے اظہار پر گویا آپ مامور یا مجبور تھے۔ ان علوم ومعارف کے ذخیرہ کو حضرت ممدوح کے دو (۲) رشید شاگردوں مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی نے الواح اوراق میں جمع کر کے اہل علم پر ایک ناقابل مکافات احسان فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ ان دونوں محقق فاضلوں کو جزاء خیر عطاء فرمائے اور حضرت شاہ صاحب کی روحانیت سے اُن کی نسبت کو اور زیادہ قوی فرمائے۔ (آمین)

عمر بھر امام ابوحنیفہؒ کی نمک حرامی کی :

حضرت ممدوح کا یہ جملہ کہ عمر بھر ابوحنیفہؒ کی نمک حرامی کی۔ شاید اس طرف مشیر ہے کہ حضرت ممدوح جہاں روایات حدیث میں تطبیق وتوفیق روایات کا اُصول اختیار فرمائے ہوئے تھے وہیں روایات فقہیہ میں بھی آپ کا اُصول تقریباً تطبیق وتوفیق ہی کا تھا، یعنی مذاہب فقہا کے اختلافات کی صورت میں حنفیہ کا وہ قول اختیار فرماتے جس سے خروج عن الخلاف ہو جائے اور دونوں فقہ باہم جڑ جائیں، اگرچہ یہ قول مفتیٰ بہ بھی نہ ہو اور مسلک معروف کے مطابق بھی نہ ہو، نظر صرف اس پر تھی کہ دو (۲) فقہی مذہبوں میں اختلاف جتنا کم سے کم رہ جائے وہی بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بعض مواقع پر خود امام کا قول بھی چھوٹ جاتا اور صاحبین کا قول زیر اختیار آ جاتا تھا۔ یعنی فقہ حنفی کے دائرے سے تو کبھی باہر نہیں جاتے تھے۔ مگر ابوحنیفہؒ کے بلاواسطہ قول سے کبھی کبھی باہر نکل جاتے تھے۔ خواہ وہ بواسطہ صاحبین ابوحنیفہؒ ہی کا قول ہو۔ شاید اس کو حضرت ممدوح نے ابوحنیفہؒ کی نمک حرامی کرنے سے تعبیر فرمایا ہے۔

اقوال ابوحنیفہؒ کا اختیار و ترجیح :

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں اس توسع سے رجوع کر کے کھلے طور پر مذہب کے معروف و مفتیٰ بہ حصے بلکہ اقوال ابی حنیفہ کے اختیار و ترجیح کی طرف طبیعت آ چکی تھی اور یہ بلاشبہ اس کی دلیل ہے کہ ابوحنیفہؒ کی خصوصیات کے بارہ میں حق تعالیٰ نے انہیں شرح صدر عطا فرما دیا تھا اور وہ بالآخر اسی خیمۂ کبیری پر جم کر چلنے لگے تھے، جس پر ان کے شیوخ سرگرم رفتار رہ چکے تھے۔

مناظرانہ مباحث :

اسی کے ساتھ درس حدیث کے سلسلہ میں مذاہب اربعہ کے اختلافات بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی مناظرانہ صورت حال بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ان مناظرانہ مباحث اور فرعیاتی اختلافات سے کتاب و سنت کے ہزارہا مکنون علوم وانکشاف ہوتے تھے جو اس اختلاف کے بغیر حاصل ہونے ممکن نہ تھے اور پھر ان فرعیات کا تزاحم اور تزاحم کے بعد قول فیصل حضرت ممدوح کے قلب و لسان سے ظاہر ہوتا تو ظرف کی خصوصیات لگ جانے سے عجیب و غریب اور نئے نئے علوم پیدا ہوئے، پھر ان تزاحمات میں محاکمہ اور ترجیح کے سلسلہ سے جو تنقیحات بیان ہوئیں وہ خود مستقل علوم و معارف کا ذخیرہ ہوتی تھیں۔

اعراب کی تصحیح کا اہتمام :

حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب بیان کرتے ہیں :

جو طلبہ صرف و نحو کی خامی اور عربی استعداد کی کمزوری کی وجہ سے حدیث صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور اعراب میں غلطیاں کرتے تھے، حضرت شاہ صاحب ان کے لئے حدیث

پڑھنا جائز نہیں سمجھتے تھے، اس طرح اگر طالب علم سے سبق قرات میں کسی ایسے راوی کے نام میں غلطی ہوتی جو سلسلہ سند میں بار بار اور کثرت سے آتا تو اس سے بھی آپ کو بڑی سخت اذیت ہوتی تھی اور گویا یہ تکلیف آپ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

ایک دن ترمذی کا سبق ہو رہا تھا۔ ایک طالب علم نے عبارت پڑھنی شروع کی۔ شاید پہلی یا دوسری حدیث تھی۔ سلسلہ سند میں آیا "عَنِ الشَّعْبِی" اس بیچارہ نے بجائے شَعْبِی کے شُعْبِی پڑھا۔ حضرت استاذ نے تصحیح فرماتے ہوئے فرمایا "عَنِ الشَّعْبِی" لیکن اس بندۂ خدا کی زبان سے پھر وہی نکلا عَنِ الشُّعْبِی۔ حضرت نے اسی وقت سبق سے اٹھا دیا اور فرمایا جو لوگ اتنے ناقص الاستعداد اور کم فہم ہوں کہ روزانہ سند میں آنے والے راویوں کے صحیح ناموں سے بھی واقف نہ ہوں اور بار بار بتلانے سے بھی نہ سمجھ سکیں ان کو دورۂ حدیث میں شریک نہیں ہونا چاہئے۔

لایعنی سوال و جواب سے احتراز :

صحیح قسم کے طالب علمانہ سوالات سے حضرت بہت خوش ہوتے تھے اور بڑی بشاشت کے ساتھ جواب مرحمت فرماتے تھے۔ لیکن مہمل قسم کے اور لایعنی یا غیر متعلق سوالات کی بالکل گنجائش اور اجازت نہ تھی۔ جس سال یہ عاجز دورۂ حدیث میں تھا اس سال دورہ میں تقریباً سو طالب علم تھے۔ ان میں سے ۴۔۵ کو حضرت نے خود متعین فرمایا تھا کہ صرف یہی سوال کیا کریں اور ان کے علاوہ جس کو سبق کے سلسلہ میں کچھ پوچھنا ہو وہ پہلے ان کو بتلا دے، اگر یہ اس کو پیش کرنے کے قابل سمجھیں تو پیش کریں۔ حضرت کے اس طرز عمل کی وجہ سے کسی فضول اور لایعنی بات میں بالکل وقت ضائع نہیں ہوتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت کا یہ ہمیشہ کا رویہ تھا یا اسی سال یہ طرز عمل اختیار فرما لیا۔ (حیات انور ص ۲۱۰ تا ۲۱۷)

درسِ حدیث کے دس خصوصیات :

حضرت مولانا محمد ادریس اپنے فاضل استاد حضرت مولانا محمد انور شاہ کے درسِ حدیث کی خصوصیات کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :

۱) درسِ حدیث میں سب سے اوّل اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے تھے کہ حدیث نبوی کی مراد باعتبار قواعد عربیت وبلاغت واضح ہو جائے۔ حدیث کی مراد کو علمی اصطلاحات کے تابع بنانے کو پسند نہ فرماتے تھے کیونکہ اصطلاحات بعد میں پیدا ہوئیں اور حدیث نبوی زماناً ورتبۃً مقدم ہے۔ حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلاف ادب ہے۔

۲) خاص خاص مواضع میں حدیث نبوی کے ماخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے اور اسی مناسبت سے بہت سی مشکلات قرآنیہ کو حل فرمادیتے تھے۔

۳) حسب ضرورت اسماء الرجال پر کلام فرماتے۔ خصوصاً جن رواۃ کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہوتا تو اس جرح وتعدیل کے اختلاف کو نقل کر کے اپنی طرف سے ایک قول فیصل بتلادیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابل قبول ہے۔ اس کی روایت حسن کے درجہ میں ہے یا صحیح کے، قابل رد ہے یا قابل اغماض یا لائق مسامحت۔ اغماض ومسامحت میں جو فرق ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ زیادہ تر فیصلہ کا طریقہ یہ بھی رکھتے کہ جب کسی روای کی جرح وتعدیل میں اختلاف ہوتا تو یہ بتلادیتے کہ یہ راوی ترمذی کی فلاں سند میں واقع ہے اور امام ترمذی نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے۔

۴) فقہ الحدیث پر جب کلام فرماتے تو اولاً ائمہ اربعہ کے مذاہب نقل فرماتے اور پھر

اُن کے وہ دلائل بیان فرماتے جو ان مذاہب کے فقہاء کے نزدیک سب سے زیادہ قوی ہوتے، پھر اُن کا شافی جواب اور امام اعظمؒ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے۔

۵) نقل مذاہب میں قدماء کی نقول پیش فرماتے اور اُن کو متاخرین کی نقول پر پیش فرماتے اور اُن کو متاخرین کی نقول پر مقدم رکھتے ائمہ اجتہاد کے اصل اقوال پہلے نقل فرماتے پھر مشائخ کے اقوال ذکر فرماتے۔

۶) مسائل خلافیہ میں تفصیل کے بعد یہ بھی بتلادیتے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے کہ گویا وہ ایک قسم کا فیصلہ ہوتا جو طلبہ کے لئے موجب طمانیت ہوتا۔

۷) درسِ بخاری میں تراجم کے حل کی طرف توجہ فرماتے۔ اولاً بخاری کی غرض مراد واضح فرماتے۔ بہت سے مواقع میں حل تراجم میں شارحین کے خلاف مراد متعین فرماتے تھے۔ ثانیاً یہ بھی بتلاتے کہ اس ترجمۃ الباب میں امام بخاری نے ائمہ اربعہ میں سے کس امام کا مذہب اختیار فرمایا ہے۔ پوری بخاری آپ سے پڑھنے کے بعد یہ واضح ہوتا کہ سوا مسائل مشہورہ کے اکثر جگہ امام بخاری نے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی موافقت کی ہے۔

۸) حافظ ابن حجر عسقلانی چونکہ امام شافعی کے مقلد ہیں، اس لئے امام شافعی کی تائید میں جا بجا امام طحاوی کے اقوال اور استدلال نقل کر کے اس امر کی پوری سعی کرتے ہیں کہ امام طحاوی کا جواب ضرور ہو جائے۔ بغیر امام طحاویؒ کا جواب دیے گذرنے کو حافظ ابن حجر یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے حق شافعیت ادا نہیں کیا۔ درس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ مسائل فقہیہ میں حافظ ابن

حجرؒ کا جواب دیے بغیر نہ گذرتیں۔

۹) اسرار شریعت میں شیخ محی الدین بن عربی اور شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ کا کلام زیادہ نقل فرماتے تھے۔

۱۰) درس حدیث کی تقریر مختصر مگر نہایت جامع ہوتی تھی، جس سے ذی علم مستفید ہو سکتے تھے ہر کس و ناکس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔

درسی معارف وافادات:

ذیل میں حضرت محدث کبیر مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کے درس حدیث سے متعلق چند افادات نذر قارئین ہیں۔ جن سے حضرت شاہ صاحب کی محدثانہ جلالت قدر کا پہلو سامنے آتا ہے۔

حیاء کی ایک ہی قسم ہے:

الحیاء شعبة من الایمان — حیا ایمان کی شاخ ہے۔ حضرت شاہ صاحب اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں: میں حیا کو دو قسموں میں اس انداز پر تقسیم نہیں کرتا جو عام علماء کی رائے ہے، یعنی شرعی وعرفی۔ میرے خیال میں حیاء کی ایک ہی قسم ہے۔ البتہ متعلق کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔ جس پر ذکر الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کے ارتکاب میں خدا سے حیا کرتا ہے اور جس پر دنیا کا غلبہ ہوتا ہے، وہ صرف ان چیزوں سے بچتا ہے جو اہل دنیا کی نظر میں معیوب ہوتی ہیں۔ اس لئے حیا ایک ہی ہے صرف اس کے متعلق بدل رہے ہیں، پھر بھی یہ پیش نظر رہے کہ بعض اخلاق حسنہ ایمان کے مبادی ہیں جو ایمان سے بھی پہلے آتے ہیں اور ان پر ایمان کا رنگ چڑھتا ہے۔

خصائل کفر اور ایمانی اداؤں کا حکم:

حدیث میں ہے: لا ایمان لمن لا امانة له ۔ اس سے معلوم ہوا کہ امانت ایمان سے مقدم ہے بلکہ حیا کو بھی ایمان سے مقدم سمجھنا چاہئے اور یہ بھی محفوظ رہے کہ مؤمن میں بعض اوقات خصائل کفر ہوتی ہیں اور بعض کفار میں ایمانی عادات واخلاق۔ لیکن مؤمن کافرانہ اداؤں کی بنا پر ایمان سے خارج نہیں ہوتا البتہ ان خصائل کی بنا پر زمرۂ مؤمنین میں محبوب نہ ہوگا۔

حسن ادب اور سلامتی فکر کا شہکار:

انما انا قاسمٌ واللّٰه یعطی — جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں اور دینے والے حقیقت میں خدا ہی ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس حدیث کے ذیل میں یہ افادات ذکر کئے ہیں۔

دینا ہو یا تقسیم کرنا ان سب امور کا تعلق تو خدائے تعالیٰ سے ہے، اگرچہ بظاہر آپ معطی بھی ہیں، جیسا کہ آپ قاسم ہیں، اس لئے حدیث میں اشکال ہے کہ آپ نے خود اپنے اور خدا تعالیٰ کے درمیان دینے اور تقسیم کرنے کا فرق قائم کرلیا۔

میں نے غور وفکر کیا تو محسوس ہوتا ہے کہ جناب رسول اکرم ﷺ نے دونوں جملوں میں صرف ظاہر کا لحاظ فرماتے ہوئے یہ تقسیم فرمائی اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد عوام کے رجحان وفکر کے مطابق ہے۔ عوام بھی فاعل حقیقی کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ جس سے ملتا ہے اسی کی طرف منسوب کردیتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ زید نے مجھ کو فلاں چیز دی دینے کا فاعل زید کو بتایا گیا اور جو حقیقت میں دینے والا ہے۔ اس کی جانب نسبت نہیں کی گئی۔

میری اس تفصیل کے پیش نظر آنحضور ﷺ کے لئے راہ عمل ہوتی ہے۔ آپ نے جس طرح اپنے آپ کو قاسم ٹھہرایا ایسے ہی آپ اپنے کو معطی بھی کہہ سکتے تھے لیکن آپ نے ایک اور حقیقت پر نظر رکھی، وہ یہ کہ دینے والا بلند رتبہ اور مستقل ہوتا ہے اور تقسیم کرنے والا صرف ذریعہ بنتا ہے اور لینے والے کی حیثیت کمتر ہوتی ہے تو آپ ﷺ نے بلندی ورفعت استقلال واستحکام خدائے تعالیٰ کے لئے ثابت کیا جو ان کے شایان شان ہے اور اپنی جانب وہ چیز منسوب کی جو آپ کی بشریت کے حسب حال ہے۔ گویا کہ آپ کا یہ ارشاد آپ کے حسن ادب اور سلامتی طبع وفکر کا مظہر ہے۔ اس میں توحید افعال کی بحث کھڑی کر دینا مناسب نہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے اور اس حدیث کے تحت کہ انبیاء علیہم السلام اپنی حیات وممات میں کسی چیز پر قادر نہیں ہوتے اس لئے آنحضور ﷺ نے خود کو قاسم ٹھہرایا ہے اور اپنے بارے میں مالک نہیں فرمایا، اگر حافظ کی یہ تقریر صحیح رہے تو پھر حدیث میں کسی تاویل کی ضرورت باقی نہیں رہیگی۔

احوال برزخ کا ترتب اعمال دنیا پر ہوتا ہے:

وہ احادیث جن میں ہے کہ قبر میں میت سے سوال وجواب ہوگا، اگر اس کے جوابات صحیح ہوں گے تو فرشتے اس سے کہیں گے کہ دلہنوں کی طرح سو جاؤ۔ اس بارے میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برزخ میں عمل وشغل ختم ہو جائے گا، جبکہ بعض احادیث سے جو مسند دارمی میں موجود ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مردے قبر میں بعض مشاغل جاری رکھتے ہیں۔ اذان بھی دیتے ہیں، اقامت بھی کہتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ تلاوت بھی کرتے ہیں اور بخاری کی روایت میں تو ان کے حج کا تذکرہ ہے۔ قرآن مجید میں بھی برزخی زندگی کے بارے میں مختلف ارشادات

ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر ہے کہ مردے حشر میں بعد النشر کہیں گے من بعثنا من مرقدنا، ہمیں ہمارے قبور سے کس نے اٹھا دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموات قبر میں سوتی ہیں اور انہیں کوئی بھی احساس نہیں، پھر قرآن نے دوسرے موقع پر فرمایا کہ:

النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۔ (المومن ۴۶)

ترجمہ: آگ جس کے سامنے یہ ہر صبح وشام لائے جاتے ہیں۔

آگ صبح اور شام فرعون اور اس کے ہم خیال لوگوں پر پیش کی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برزخ میں احساس ہے، ورنہ تو آگ کو سامنے لانے سے کیا فائدہ؟

میری رائے ان متضاد بیانات کی بنا پر یہ ہے کہ برزخی زندگی میں یکساں احوال نہیں بلکہ دنیاوی زندگی کے مطابق حسن عمل اور بدعملی کی بنا پر قبر کی زندگی کے احوال بدلتے ہیں۔ اس لئے بعض قبر میں پڑے سوتے ہیں اور بعض برزخی حیات میں طرح طرح کی راحتوں ونعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ برزخی زندگی کو حدیث میں نوم کے ساتھ اس وجہ سے تعبیر کیا کہ لغت عرب میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جو برزخ کی زندگی کی کیفیات کو ادا کر سکے۔ اس لئے وہی لفظ انتخاب کیا گیا جو برزخی زندگی کی کیفیات کو فی الجملہ ادا کر سکے اور وہ نوم ہی ہے نوم موت سے مشابہ ہے، اس وجہ سے حدیث میں النوم اخ الموت کے لفظ آئے ہیں، برزخ اس دنیوی زندگی کے انقطاع اور ایک دوسری زندگی کا آغاز ہے۔ ایسے ہی نوم میں فی الجملہ انقطاع ہے۔ (تلخیص از نقش دوام)

علم حدیث سے عشق وفریفتگی:

حضرت شاہ صاحبؒ کو علم حدیث سے عشق وفریفتگی کا تعلق تھا اور اس کی نشرو

اشاعت کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد اولین قرار دے رکھا تھا۔ حدیث کی اشاعت و خدمت کے سلسلہ میں محدث کبیر حضرت شاہ صاحبؒ کی مساعی اس دور میں تجدیدی اور اجتہادی شان اور احیاء کا رنگ رکھتی ہیں، ان ہی کی مساعی سے پاک و ہند میں حدیث کا سکہ رائج الوقت کی طرح چلن ہوگیا۔ درسِ حدیث کے مستقل حلقے قائم ہوئے۔ نشرِ احادیث کے دور کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور دیکھتے دیکھتے آپ کے شاگردوں کی ایک عظیم جماعت تیار ہوگئی۔ حضرت شاہ صاحب کی پوری زندگی حدیث کی تشریح و تفہیم، تدریس و تعلیم اور اشاعت و تبلیغ میں گزری۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

☆☆☆☆☆☆☆

باب : ۵

تصنیف و تالیف اور تحقیق کے نادر نمونے و شہ پارے

قدرت کا عجیب نظام ہے کہ علماء اُمت اور ارباب ولایت کے مزاج اتنے مختلف ہیں کہ عقل نارسا حیران رہتی ہے۔ کوئی دینی خدمت، تعلیم و ارشاد اور افادہ و افاضہ کے پیش نظر تصنیف و تالیف میں مشغول نظر آتا ہے۔ کوئی اصلاح و تربیت کے حرص کی خاطر حلقۂ صحبت و استفادہ کو وسیع کرنے کی فکر میں مصروف ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ خمول پسندی، وجاہت و شہرت سے نفرت کی بنا پر گم نامی کو اپنا شیوۂ امتیاز بنائے ہوئے ہے۔ نہ نظام قدرت کے عجائب کی انتہا ہے نہ کائنات کی نیرنگیوں کا شمار۔

محیر العقول جامعیت :

حضرت امام کشمیریؒ کو بھی اللہ نے ایک طرف علمی تبحر، محیر الافکار جامعیت، حیرت افزا دقت نظر، فوق العادۃ حافظہ، کتب بینی و مطالعہ کا عجیب شوق و ذوق عطا فرمایا۔ دوسری طرف خمول پسندی، وجاہت و شہرت سے نفرت اور تواضع و فروتنی کے کمالات سے سرفراز فرمایا۔ حضرت کشمیریؒ کی پوری زندگی مطالعہ کتب میں گذری اور زندگی بھر کچھ نہ کچھ جواہر ریزے ان کے قلم گوہر بار سے نکلتے رہے۔ مشکلات و حقائق پر اپنی یادداشتیں لکھتے رہے اور علمی افکار و نظریات بھی قلم بند کرتے رہے لیکن کبھی مستقل تالیف و تصنیف کا شوق دامن گیر نہ ہوا۔

اگر سنن ترمذی کی شرح لکھ دیتے تو !

حضرت امام کشمیریؒ کے شاگرد رشید محدث کبیر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ

فرماتے ہیں: کاش ! اگر ہمارے حضرت امام کشمیریؒ کو اپنے علوم و معارف کے پیش نظر تصنیف و تالیف کا سواں حصہ بھی شوق ہوتا تو آج علمی دنیا کا دامن اُن کے علوم و تحقیقات سے پُر ہوتا اور ان کے علمی جواہرات سے اہل علم مالا مال ہوتے اور آئندہ نسلیں صحیح معنوں میں ان کی معرفت و قدر دانی میں کوتاہی نہ کرتیں۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ نے ایک دفعہ عرض کیا کہ اگر جامع ترمذی پر کوئی شرح تالیف فرما دیتے تو پس ماندگان کے لئے سرمایہ ہوتا۔ غصہ میں آ کر فرمانے لگے کہ زندگی بھر نبی کریم ﷺ کی احادیث پڑھا کر پیٹ پالا۔ کیا آپ یہ چاہتے کہ مرنے کے بعد میری حدیث کی خدمت بکتی رہے۔

مشیت الٰہی کو یوں منظور تھا کہ حضرت نے صرف چند رسائل ہی یادگار چھوڑے ہیں۔ جن میں فاتحہ خلف الامام، رفع یدین، مسئلہ وتر اور فتنہ قادیانیت کی تردید میں چند کتابیں شامل ہیں۔

تصنیفی اور تالیفی خصوصیات :

حضرت مولانا یوسف بنوریؒ نے نفحۃ العنبر ص ۱۰۵ پر حضرت امام کشمیریؒ کی تصنیفی و تالیفی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مولانا بنوریؒ فرماتے ہیں :

جامعیت و دقت نظر و سرعت انتقال ذہنی و کثرت آمد کی بناء پر طبیعت اختصار کی عادی بن گئی تھی۔ معلومات کی فراوانی کی وجہ سے ضمنی مضامین کثرت سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ حدیث کے لطائف میں جب علم عربیت و بلاغت کے نکات کا بیان شروع ہو جاتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ علوم عربیت کی تحقیقات ہی شاید کتاب کے اصلی موضوع ہیں۔ بعید ترین و محمود ترین ماخذ سے وہ نقول پیش فرمایا کرتے جن سے محققانہ شروح حدیث کا دامن

بھی خالی ہوتا تھا۔ افسوس کہ اختصار کی وجہ سے میں اس کی مثالیں پیش نہیں کر سکتا۔ اس لئے عام نگاہیں ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں اور یہ مشکل عام طبیعتیں لذت اندوز ہوتی تھیں۔ حضرت کے مختصر سے مختصر رسالے کے لئے بھی سارے علوم سے نہ صرف مناسبت بلکہ مہارت ان میں ضروری ہے۔ ان تصانیف کی صحیح قدر دانی وہی عالم کر سکتا ہے کہ کسی موضوع میں ان کو مشکلات پیش آئی ہوں اور پورے متعلقات کی چھان بین کر چکا ہو اور تشفی نہ ہوئی ہو، پھر حضرت امام العصر کی تالیف کا غور سے مطالعہ کی توفیق ہو، اس وقت قدر شناسی و قدر دانی کی نوبت آئے گی اور حقائق مطلوب کے چہرے سے پردے ہٹتے چلے جائیں گے خالی ذہن غیر مبتلا شخص جس کو کبھی کسی مشکل کی خلش ہی پیش نہ آئی، سطحی مضامین و شگفتہ عبارت سے مانوس ہو وہ کبھی قدر نہیں کر سکتا۔

تصنیفات کا اجمالی تعارف (پہلی قسم) :

حضرت امام کشمیریؒ کی تصنیفات کا تعارف مولانا بنوریؒ کے سحر آفرین قلم سے نذر قارئین ہے :

(۱) عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام :

یہ کتاب ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ عقیدۂ حیات مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم کی کیا ہدایات ہیں۔ اس کی تفصیل ہے۔ اس میں احادیث کا استقصاء و استیفا نہیں کیا گیا ہے۔ بقدر ضرورت ضمناً احادیث کا ذکر ہے۔ اس لئے اس کا دوسرا نام ہے "حیاۃ المسیح بمتن القرآن و الحدیث الصحیح" ضمنی مسائل کی تحقیقات کی آگئی ہیں۔

عقیدہ حدوث عالم، عقیدۂ ختم نبوت، کنایہ حقیقت ہے یا مجاز؟

ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج کی تحقیق، سد ذی القرنین کی تعیین وغیرہ وغیرہ۔
حضرت شیخ عثمانی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب حضرت شاہ صاحبؒ کی سب کتابوں میں واضح و مفصل و شگفتہ ہے۔

(۲) تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام :

یہ کتاب ۱۵۰ صفحات کی ہے۔ ''عقیدۃ الاسلام'' کی تعلیقات اور اس پر اضافات ہیں، ادب و بلاغت کی عجیب و غریب ضمنی تحقیقات آ گئی ہیں۔

(۳) التصریح بما تواتر فی نزول المسیح :

نزول مسیح علیہ السلام کے متعلق احادیث و آثار صحابہ کو اس میں بہت تفتیش و دیدہ ریزی سے جمع کیا گیا ہے، جن کی تعداد تقریباً سو تک پہنچ جاتی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا اس پر ایک نفیس مقدمہ بھی ہے۔

(۴) اکفار الملحدین فی ضروریات الدین :

۱۲۸ صفحہ کا ایک عجیب و غریب رسالہ ہے، جس میں کفر و ایمان کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالی گئی اور اصولی طور پر بحث کی گئی ہے کہ مدار ایمان کیا کیا امور ہیں اور کن عقائد و اعمال کے انکار سے کفر لازم آتا ہے اور کس قسم کے عقائد میں تاویل کرنا بھی موجب کفر ہے۔

اس موضوع پر امت میں سب سے پہلے امام غزالیؒ نے قلم اٹھایا تھا۔
''فیصل التفرقہ بین الاسلام و الزندقہ'' ان کا رسالہ مصر و ہندوستان میں عرصہ ہوا کہ شائع ہو چکا ہے۔ اس رسالے کی عمدہ تحقیقات حضرت شیخ نے چند سطروں میں نقل فرمائی ہیں۔ عصر حاضر میں یہ ایک اہم ترین دینی خدمت تھی۔ وہ حضرت نے پوری

فرما دی۔ اس پر سارے علماء دیوبند کی رائیں اس لئے لکھوا دی ہیں تاکہ اہل حق جماعت میں اس اہم ترین مسئلہ میں کوئی اختلاف نہ رہے۔

(۵) خاتم النبیین :

یہ عقیدۂ ''ختم نبوت'' میں عجیب رسالہ ہے جو ۹۶ صفحات پر پھیل گیا ہے۔ فارسی زبان میں ہے لیکن دقیق۔ حضرت کا خاص اسلوب، علمی کمالات اور وہبی علوم کے نمونے پورے طور پر جلوہ آرا ہیں۔
حضرت مولانا سید سلیمان صاحبؒ نے بھی ایک دفعہ ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ بہت دقیق ہے، عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

(۶) فصل الخطاب فی مسئلۃ أم الکتاب :

مسئلہ ''فاتحہ خلف الامام'' جو عہد صحابہ سے لے کر آج تک معرکۃ الآراء موضوع رہا ہے۔ اس پر ۱۰۶ صفحات کا محققانہ رسالہ ہے۔ حدیث عبادہ بروایت محمد بن اسحاق کی عجیب و غریب تحقیق کی گئی۔ بڑی تدقیق کے ساتھ اس اہم موضوع کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ لفظ ''فصاعداً'' کی تحقیق میں ۱۲، ۱۳ صفحات پر مشتمل دقیق ترین مضمون آ گیا ہے۔ یہ مضمون چونکہ عام دسترس سے بالکل باہر تھا، راقم الحروف نے اپنی کتاب معارف السنن شرح ترمذی (مخطوط) میں اس کی جدید اسلوب عصری سے تحلیل و تشریح کی ہے اور شگفتہ عربی میں اس کی تسہیل کی کوشش کی ہے۔
حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم کو ڈابھیل میں جب یہ مضمون سنایا، نہایت محظوظ ہوئے اور بے ساختہ فرمایا کہ حق تعالیٰ جزاء خیر عطا فرمائے کہ اس مشکل ترین دقیق و غامض مضمون کی ایسی افصاح کی کہ شاید مقدور میں اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔

(۷) خاتمة الخطاب في فاتحة الكتاب :

مسئلہ "فاتحہ خلف الامام" پر فارسی زبان میں لطیف رسالہ بغیر مراجعت کتاب دو روز میں محرم ۱۳۳۰ھ میں تالیف فرمایا ہے۔ مسئلہ پر جدید انداز میں استدلال ہے۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی اس پر تقریظ بھی ہے۔ حضرت شیخ نے وقت نظر کی خوب داد دی ہے۔

(۸) نيل الفرقدين في مسئلة رفع اليدين :

۱۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مسئلہ خلافیہ نماز میں رکوع سے پہلے اور بعد میں ہاتھوں کو اٹھانے کے موضوع پر نہایت عجیب انداز میں تحقیق فرمائی ہے اور نہایت انصاف سے محققانہ انداز میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ مسئلہ میں اختلاف عہد صحابہؓ سے ہے اور اس میں اولویت کا اختلاف ہے۔ جائز ناجائز کا اختلاف نہیں۔ ضمنی طور پر نفیس مباحث آ گئے ہیں۔

(۹) بسط اليدين لنيل الفرقدين :

سابق الذکر موضوع پر چونسٹھ (۶۴) صفحات کا رسالہ ہے۔ یہ رسالہ سابق "نیل الفرقدین" کا تکملہ ہے اس موضوع پر قدماء محدثین سے لے کر متاخرین اور عصر حاضر تک بہت کچھ خامہ فرسائی ہو چکی ہے۔ اس پامال موضوع پر ایسے محققانہ اسلوب میں جدید استدلالات و دقیق استنباطات پیش کرنا یہ حضرت شاہ صاحب ہی کا حصہ ہے۔ الشیخ الامام محمد زاہد الکوثری اپنی کتاب "تانيب الخطيب فيما ساقه في ترجمة ابي حنيفة من الاكاذيب" ص ۱۴۲ میں رقمطراز ہیں :

هذا البحث اى رفع اليدين بحر طويل الذيل الفت فيه كتب من الجانبين و من احسن ما الف في هذا الباب نيل الفرقدين و بسط اليدين كلاهما لمولانا العلامة الحبر البحر محمد انور شاه الكشميرى و هو جمع في كتابيه لب اللباب فشفى و كفى اه۔

رفع الیدین کے موضوع پر جانبین سے مخصوص کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس موضوع پر بہترین کتابیں علامہ حبر و بحر مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی دو کتابیں ہیں: نیل الفرقدین اور بسط الیدین جن میں سارا لب لباب آ گیا ہے اور یہ شافی و کافی ہیں۔

درحقیقت صحیح قدردانی ایسے محققین ہی کر سکتے ہیں۔

(۱۰) كشف الستر عن صلاة الوتر :

مسئلہ "وتر" کے بارے میں اُمت میں جو اختلافات چلے آئے ہیں کل خلافیات سولہ سترہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں جو مشکل ترین وجوہ ہیں، ان کی ایسی تحقیق و فیصلہ کن تدقیق فرمائی ہے کہ کسی منصف مزاج کو مجال انکار باقی نہیں رہتا۔ رسالہ ۹۸ صفحوں میں تمام ہوا۔ دوسرے ایڈیشن میں بقدر ایک ثلث تعلیقات کا اضافہ فرمایا ہے۔ مسئلہ آمین بالجہر وضع الیدین علی الصدور وغیرہ مسائل کی تشفی کن تحقیق فرمائی گئی ہے۔ شروع میں خطبہ کے بعد ایک فصیح و بلیغ عربی کا قصیدہ جو نہایت ہی مؤثر اور رقت انگیز ہے۔ ہر حیثیت سے قابل دید ہے۔

(۱۱) ضرب الخاتم على حدوث العالم :

"حدوث عالم" علم کلام و فلسفہ کا معرکۃ الآراء موضوع ہے۔ متکلمین و فلاسفہ اسلام نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ مستقل رسائل کا موضوع بحث رہا ہے۔ شیخ جلال الدین دوانی نے بھی اس پر ایک رسالہ "الزوراء" کے نام سے تصنیف کیا ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ نے اس سنگلاخ وادی میں قدم رکھا ہے اور الٰہیات و طبعیات اور قدیم و جدید فلسفہ کی رو

سے اتنی کثرت سے دلائل و براہین قائم کئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اور "حدوث عالم" کا مسئلہ نہ صرف یقینی بلکہ بدیہی بن جاتا ہے، لیکن افسوس کہ حضرت نے ان براہین و دلائل وشواہد کو چار سو (۴۰۰) شعر میں منظوم پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شعر کا دامن تفصیلات سے خالی رہتا ہے، لیکن اس کے ایضاح وحل کے لئے ہزاروں حوالے کتب متعلقہ کے دیئے گئے، جن میں صدر شیرازی کی "اسفار اربعہ" "فرید وجدی" و بستانی کے دائرۃ المعارف خصوصیت رکھتی ہیں۔ راقم الحروف نے حضرت کے حکم سے متعلقہ حوالہ جات تقریباً ایک سو صفحات میں بڑی عرق ریزی سے جمع کئے تھے جس سے حضرت بے حد مسرور تھے اور میری اس ناچیز خدمت کو ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے سامنے بہت سراہا تھا۔ فرماتے تھے کہ اصل موضوع تو "اثبات باری" تھا، لیکن عنوان میں ایک قسم کی شناعت تھی۔ اس لئے "حدوث عالم" کا عنوان تجویز کیا اور آخر میں دونوں کا مفاد ایک نکلتا ہے۔

(۱۴) مرقاۃ الطارم لحدوث العالم :

سابق الذکر موضوع پر ۶۲ صفحات میں رسالہ ہے۔ رسالہ کیا ہے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس رسالے میں ادلہ و براہین کے استقصاء کا ارادہ نہیں فرمایا، بلکہ یہ "ضرب الخاتم" کے لئے مقدمات وتشریح وتفسیر کا کام دیتا ہے۔ نظائر وشواہد موضوع پر اتنے پیش کئے ہیں کہ عقلی برہان سے پہلے ذوق ووجدان فیصلہ کر لیتا ہے۔ ترکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری جو قاہرہ میں جلاوطنی کے بعد مقیم تھے اور رد ملاحدین ودہریین میں نہایت ہی متخصص جلیل القدر عالم تھے۔ ترکی وعربی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں تالیف فرما چکے تھے۔

۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں یہ رسالہ ان کو راقم الحروف نے دیا تھا۔ مطالعہ فرمانے کے بعد اتنے متاثر ہوئے اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ فلسفہ وکلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں زندہ ہے اور پھر فرمایا :

انی اُفضّل هذه الوريقات على جميع المادة الداخرة فى هذا الموضوع و انى افضلها على هذه الاسفار الاربعة للصدر الشيرازى ۔ یعنی جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے، اس رسالہ کو اس سب پر ترجیح دیتا ہوں اور یہ اسفار اربعہ (ان کے سامنے رکھی ہوئی تھی) اتنی بڑی کتاب پر اس رسالہ کو ترجیح دیتا ہوں، پھر اس وقت "القول الفيصل" کے نام سے رد دہریین میں ایک مبسوط کتاب تالیف فرما رہے تھے۔ اس میں اس رسالہ سے بہت نقول لئے اور اس کتاب میں اس رسالہ کی بڑی تعریف کی۔

ایک حصہ اس کا طبع ہو چکا ہے نہ معلوم یہ عبارت اس حصہ میں آ گئی یا نہیں۔ ضمناً اس رسالہ میں کلام وتصوف الٰہیات وطبیعات کے بہت سے حقائق کا فیصلہ فرمایا گیا ہے۔

(۱۳) إزالة الرين فى الذب عن قرة العينين :

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتاب " قرة العينين فى تفضيل الشيخين " کا حیدر آباد دکن میں کسی شیعی مزاج عالم نے رد لکھا تھا۔ حضرت امام العصر نے شاہ دہلوی کی تائید میں اس کی تردید لکھی۔ نہایت عمدہ کتاب ہے۔ ۱۹۶ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں قال المولى المؤلف کہہ کر شاہ دہلوی کی عبارت نقل فرماتے ہیں۔ قال المعترض سے تردید کرنے والے کی عبارت اور اقوال سے اس کی تردید فرماتے ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے کشمیر میں ملا تھا۔ جلد وسے ۱ صفحے غائب ہیں۔ اس لئے [illegible]

نہ معلوم ہو سکا ہے اور سوءِ اتفاق سے حضرت شیخؒ سے پوچھنے کی نوبت نہ آئی" ازالۃ الریب میرا تجویز شدہ نام برائے نام ہے۔

(۱۴) سہم الغیب فی کبد اھل الریب :

(تاریخی نام "قسی سہم الغیب")

ہندوستان کی سرزمین جہاں بدقسمتی سے بہت سے بدعات اور عقائد شرکیہ بھی سادہ لوح مسلمانوں میں رائج ہو گئے ہیں۔ ایک ان میں سے "علم غیب" کا عقیدہ ہے اور سید احمد رضا خاں صاحب بریلوی اور ان کے اتباع نے اس کو علمی رنگ میں پیش کیا اور ایک عرصہ تک ہندوستان میں یہ موضوع بحث رہا۔ ایک شخص بریلوی نے اس میں ایک رسالہ لکھا اور اہل حق کے مسلک کے خلاف اپنے نامۂ عمل اور نامۂ قرطاس کو سیاہ کیا اور اپنا نام عبد الحمید دہلوی ظاہر کیا۔ حضرت شیخؒ کا قیام اس زمانہ میں دہلی میں تھا۔ آپ نے جواب ترکی بہ ترکی عبد المجید بریلوی کے نام منسوب کر کے اس کا جواب شائع فرمایا۔ رسالہ کے آخر میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ کے مناقب میں عربی میں ایک قصیدہ ہے۔ رسالہ کی زبان حضرت شیخؒ کے عام تصنیفی مذاق کے خلاف اردو ہے۔

یہ چودہ تصانیف تو امام العصر شاہ صاحبؒ کی وہ ہیں کہ اپنے قلم سے تالیف فرمائی تھیں۔

تصنیفات کی دوسری قسم :

دوسری قسم کی وہ تصنیفات ہیں کہ آپ کی یادداشتوں سے مرتب کی گئی ہیں۔ ان کا ذکر کرنا بھی میرے خیال میں ضروری ہے۔

(۱) مشکلات القرآن :

قرآن کریم کی جن آیات کریمہ کو مشکل خیال فرمایا تھا، خواہ وہ اشکال تاریخی اعتبار سے ہو یا کلامی حیثیت سے۔ سائنس کی رو سے ہو یا کسی عقلی پہلو سے یا علوم عربیت و بلاغت کی جہت سے بعنوان پر یادداشت مرتب فرمائی تھی، اگر کہیں اس پر عمدہ بحث کی گئی ہے اس کو نقل فرمایا یا حوالہ دیا اور نہیں تو خود غور و فکر کے بعد جو حل سانح ہوا تحریر میں لایا گیا۔ یہ یادداشت بہ شکل مسودات مختلف اوراق میں موجود تھی۔ مجلس علمی ڈابھیل نے مرتب کر کے اسے شائع کیا اور راقم الحروف نے مجلس علمی کی خواہش پر "یتیمۃ البیان" کے نام سے ۸۲ صفحہ کا اس کا مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ اصل کتاب ۲۸۷ صفحات پر ختم ہوئی۔ قرآنی علوم اور قرآنی معارف کا نہایت بیش قیمت گنجینہ ہے۔ اگر جدید اسلوب سے اس کو پھیلایا گیا تو ایک ہزار صفحات میں کھپ جا کر کتاب ختم ہوگی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ قرآن کریم سے متعلق کچھ اور مسودات بھی نکل آئے تھے۔ جن کی زیور طبع سے آراستہ ہونے کی نوبت ابھی نہیں آئی۔

(۲) خزینۃ الاسرار :

یہ ایک رسالہ ہے جس میں کچھ اوراد و ادعیہ کچھ مجربات و اذکار وغیرہ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ سب علامہ دمیری کی کتاب "حیاۃ الحیوان" کے اقتباسات ہیں، کہیں کہیں حضرت شاہ صاحب کی طرف سے اضافات بھی ہیں۔ یہ رسالہ حضرت کے قدیم مسودات جو کشمیر میں تھے ان میں دستیاب ہوا تھا۔ مجلس علمی ڈابھیل نے اس نام سے شائع کیا۔

(۳) فیض الباری بشرح صحیح البخاری :

یہ حضرت شاہ صاحب کے درس صحیح بخاری کی املائی شرح ہے۔ جس کو حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدینہ نے کئی سال کی محنت و عرق ریزی کے بعد فصیح و

بلیغ عربی زبان میں مرتب کیا ہے۔ یہ حضرت امام العصر کے علوم و کمالات کی نئی تصویر پیش کرتی ہے۔ جہاں حافظ شیخ الاسلام بدر الدین عینی اور قاضی القضاۃ حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے بلند پایہ محقق شارحین عاجز آگئے ہیں، وہاں شیخ کے خصائص و کمالات جلوہ گر نظر آئیں گے۔ زیادہ تر اعتنا انہی معارف حدیث کا کیا گیا۔ جہاں شارحین ساکت نظر آتے ہیں۔ حضرت شیخ کے آخری عمر کے مجرب علوم و اذواق خصوصی احساسات و علمی خصوصیات دقت نظر و تحقیقی معیار کے نمونے اہل علم و یاران نکتہ داں کے لئے صلائے عام دے رہے ہیں۔ یہ چار ضخیم جلد کا بحر بیکراں مصر میں آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ قرآن و حدیث، منطق، کلام و معانی و بلاغت وغیرہ کے نہایت بیش بہا ابحاث سے مالا مال ہے (اس پر راقم الحروف اور حضرت جامع و مرتب کے قلم سے دو مبسوط مقدمے ہیں۔ ۸۰ صفحات پر مشتمل ہیں) عام عبارت نہایت شگفتہ و سلیس ہے۔ بعض بعض مقامات میں خاصی ادبی لطافت ہے۔

(۴) العرف الشذی بشرح جامع الترمذی :

یہ حضرت شاہ صاحب کی درس جامع ترمذی کی املائی شرح ہے۔ جس کو جناب مولانا محمد چراغ صاحب ساکن ضلع گجرات نے بوقت درس قلم بند کیا ہے اور زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔ جامع ترمذی کے مشکلات احادیث احکام پر محققانہ کلام ہر موضوع پر عمدہ ترین کبار امت کے اقوال اور حضرت کی خصوصی تحقیقات کا ذخیرہ ہے۔ طلبۂ حدیث اور اساتذۂ حدیث پر عموماً اور جامع ترمذی کے پڑھانے والوں پر خصوصاً اس کتاب کا بڑا احسان ہے۔

(۵) انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد :

یہ سنن ابی داؤد کے درس کی املائی تقریر و شرح ہے جس کو مولانا محمد صدیق

صاحب نجیب آبادی مرحوم نے جمع کر کے شائع کیا ہے۔ کل دو جلدوں میں ہے۔ مرتب و جامع نے بہت سی کتابوں کی اصلی نقول کو مراجعت کر کے لفظ بلفظ درج کر دیا ہے۔ کتاب نے ترتیب میں حضرت شاہ صاحب اور ان کے شیخ حضرت شیخ الہند کے نام کی تلمیع کی گئی ہے۔

(۶) صحیح مسلم کی املائی شرح :

سنا ہے کہ ہمارے محترم دوست فاضل گرامی جناب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے صحیح مسلم کے درس کی تقریر قلم بند فرمائی تھی۔ یہ اب تک طبع نہ ہوئی۔ نہ راقم الحروف کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

(۷) حاشیہ سنن ابن ماجہ :

جناب محترم مولانا سید محمد ادریس صاحب سکروڈوی سے سنا تھا کہ آپ نے سنن ابن ماجہ پر کتاب کے حواشی و ہوامش پر تعلیقات اپنے قلم سے لکھی تھیں۔ راقم الحروف کو اس کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

یوں تو حضرت نے جن کتابوں پر تعلیقات لکھی ہیں، اگر استقصاء کیا جائے تو متعدد کتابیں نکل آئیں گے۔ "الاشباہ والنظائر" جو ابن نجیم کی فقہ میں مشہور کتاب ہے۔ اس پر تعلیقات حضرت کے قلم سے خود میں نے کشمیر میں دیکھے ہیں۔

یہ کل اکیس (۲۱) کتابیں ہوئیں جن سے حضرت امام العصر کے کمالات کے کچھ پہلو نمایاں ہو سکتے ہیں۔ کتاب کی پوری حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے کہ کتاب کے مضامین یا خصوصیات کا واضح تعارف کراتا اور جن مشکل ابحاث میں حضرت کے کمالات نظر آرہے ہیں، ان کی تفصیلات سامنے آتیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ کسی مقالے کے لئے موزوں نہیں۔ تفصیلی تبصرہ اور علوم و معارف کے نمونے پیش کرنے کے لئے ایک مستقل

تالیف کی ضرورت ہے۔ (محدث اعصر ص ۱۲۵-۱۲۶)

وسعتِ علم ونظر اور شانِ تحقیق :

تصنیف وتالیف کا ذوق اور ملکہ ایک وہبی چیز ہے۔ رب ذوالجلال جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ خالق کائنات نے حضرت امام کشمیریؒ کو تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کا تحقیقی ذوق بھی عطا فرمایا تھا ....

مثل خورشید سحر، فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزاد، معانی میں دقیق

حضرت امام کشمیریؒ کی علمی رفعت، مرتبہ ومقام، تصنیفی تالیفی اور تحقیقی ذوق اور ہمہ جہت خدمات کا تذکرہ مجھ گناہ گار کے احاطہ اور اک سے کہیں بلند ہے۔ ذیل میں حضرت کے تلمیذ رشید حضرت مولانا منظور نعمانیؒ کے قلم سے حضرت امام کشمیریؒ کی بعض مسائل میں تحقیق ملاحظہ فرمادیں۔ فرماتے ہیں :

اختلافِ مطالع کا اعتبار :

وسعتِ علم ونظر اور خاص فقیہانہ فکر کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ بعض مسائل میں آپ کی تحقیق ہمارے زمانہ کے عام علماء احناف سے الگ تھی۔ بلکہ شاید واقعہ کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہوگی کہ عام علماء واہل فتویٰ کے لئے فقہ حنفی میں وہ ایک نئی علمی دریافت ہوتی تھی۔ اس کی کئی مثالیں اس عاجز کو یاد ہیں لیکن ان میں سے ایک ایسی ہے جس کا ذکر اردو کے اس مقالہ میں بھی نامناسب نہ ہوگا۔

فقہ حنفی کا یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر دنیا کے کسی بھی گوشہ میں چاند دیکھا جائے تو دوسرے تمام مقامات پر اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ مثلاً اقصائے مغرب میں رمضان کا چاند

ایک دن دیکھا گیا تو اگر شرعاً قابلِ اعتبار ذریعہ سے اس کی اطلاع اقصائے مشرق میں رہنے والوں کو پہنچ جائے تو ان کو بھی اسی حساب سے روزہ رکھنا ہوگا۔ خاص علمی اور فقہی تعبیر اس مسئلہ کی یہ کی جاتی ہے کہ :

''حنفیہ کے یہاں اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں اور دوسرے ائمہ کے یہاں اس کا اعتبار ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا عام طور سے علمی اور فقہی حلقوں میں حنفیہ کا یہی مذہب معلوم ومشہور ہے اور عموماً اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے اور حنفی فقہ وفتاویٰ کی کتابوں میں کچھ ایسا ہی لکھا ہوا بھی ہے۔ حالانکہ ہیئت کے حساب سے یہ بالکل ناقابلِ فہم ہے''۔

حضرت استاذ قدس سرہٗ کی تحقیق اس مسئلہ میں یہ تھی کہ عام مصنفین سے اس کی تعبیر میں لغزش ہوگئی ہے اور اصل مسئلہ حنفیہ کا یہ ہے کہ ایک اقلیم میں اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں۔ فرماتے تھے کہ مشرق ومغرب کے درمیان اختلافِ مطالع کا اعتبار نہ کرنا بداہۃً غلط ہے اور حضرت استاذ اپنی اس تحقیق کے سلسلہ میں جہاں تک اب یاد پڑتا ہے ابن رشد کی بدایۃ المجتہد اور فقہ حنفی کی کتابوں میں سے بدائع کا حوالہ بھی دیتے تھے۔

واضح رہے کہ پہلے تو یہ صرف ایک قابلِ غور علمی مسئلہ تھا جو محض معقولیت پسندوں کے لئے اشکال اور خلجان کا باعث ہوتا تھا لیکن اب یہ واقعاتی مسئلہ ہوگیا ہے۔ کیونکہ اکثر ممالکِ عربیہ میں عموماً ہندوستان سے ایک دن پہلے چاند نظر آجاتا ہے اور ہیئت کے اصول پر ایسا ہی ہونا بھی چاہئے اور ہوائی جہاز جدہ سے پرواز کرکے ۸-۹ گھنٹے میں بمبئی آجاتا ہے اور ۱۲ گھنٹے سے کم میں دہلی آسکتا ہے۔ پس یہ ہوسکتا ہے کہ مثلاً ۲۹ رمضان کی شام کو کچھ لوگوں نے جدہ میں عید کا چاند دیکھا اور اسی شب کو وہ ہوائی جہاز سے روانہ ہوکر صبح کو بمبئی پہنچے تو اگر اختلافِ مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے تو ان لوگوں کی شہادت پر ہندوستان والوں

کے لئے اُس دن روزہ ختم کر کے عید منانے کا حکم دیا جائے گا۔ حالانکہ یہاں اُس روز انتیسواں (۲۹) بلکہ کبھی تو اٹھائیسواں (۲۸) ہی روزہ ہوگا۔ اپنے زمانہ کے بعض اکابر علماء و اہل فتویٰ کے متعلق سُنا ہے کہ جب اُن کے سامنے یہ واقعاتی اشکال اس مسئلہ کے متعلق پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آجائے پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا، جیسا کہ اس قسم کی ناگزیر صورتوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ عاجز عرض کرتا ہے اگر ان بزرگ کو اس مسئلہ کے متعلق حضرت اُستاذ کی مندرجہ صدر تحقیق پہنچی ہوتی تو اس مسئلہ میں فقہ حنفی کو چھوڑ کر دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دینے کو وہ ناگزیر نہ سمجھتے۔ (حیات انور ص ۱۴۴، ۱۴۵)

ایام قیام قبا کی تحقیق :

محمد عطاء اللہ صاحب لکھتے ہیں :

فرمایا یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ قبا میں چودہ روز قیام پذیر رہے۔ چنانچہ بخاری صفحہ ۵۰۶، جلد اوّل میں تصریح ہے اور جو سیر محمد بن اسحٰق میں ہے کہ قبا کا قیام چار دن رہا۔ پس وہ سہو ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ حضور ﷺ قبا میں داخل ہوئے۔ منگل کے روز اور شہر مدینہ میں تشریف لائے جمعہ کے روز۔ پس جمعہ اسی ہفتہ کا شمار کر لیا گیا اگر اعتراض کیا جائے کہ جمعہ ثانیہ کا اعتبار کرنے سے بھی حساب پورا نہیں ہوتا، کیونکہ منگل منگل آٹھ روز، بدھ، جمعرات، جمعہ تین دن مل کر گیارہ دن ہو گئے تو بخاری شریف میں مذکور چودہ دن تو پورے نہ ہوئے، جواب یہ ہے کہ جمعہ کے دن کا تشریف لے جانا قیام کی خاطر نہ تھا بلکہ جمعہ کی نماز ادا کر کے واپس آجانا مقصود تھا، پھر ہفتہ، اتوار، پیر قبا میں رہ کر منگل کو مدینہ میں تشریف لائے۔ یہ پندرہ یا چودہ روز ہو گئے۔

فضیلت حضرت ابو بکرؓ قطعی ہے :

ایک دفعہ فرمایا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی فضیلت امام اشعریؒ کے نزدیک قطعی ہے اور امام باقلانی کے نزدیک ظنی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اشعری کا فرمانا اصوب ہے۔ کیونکہ اس کثرت سے احادیث اس باب میں مروی ہیں جن سے تواتر ثابت ہو جاتا ہے بلکہ تواتر سے بھی فوق ایسا ہی افضلیت شیخین بھی ثابت ہے، پھر ترتیب بھی قرابت کے برعکس ہے، پس جو اقرب ہے نسباً وہ آخر ہے افضلیت میں۔ اس طرح کہ علیؓ، عثمانؓ، عمرؓ، ابو بکرؓ، نیز افضلیت میں صدیق اکبرؓ اقدم ہیں، پھر عمرؓ، پھر عثمانؓ، پھر علی کرم اللہ وجہہ۔

لفظ دون کی ادبی تحقیق :

فرمایا "وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيفَةً وَ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ "۔ (الاعراف: ۲۰۵) (اور اے مخص ! اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح اور شام) اس میں دون الجهر معطوف واقع ہوا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ذکر جہر کا بھی جواز ہے اور دون بمعنی ذرا کم یعنی جہر مفرط سے ذرا کم۔ فقہا کا جہر مراد نہیں بلکہ "لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ" کے قبیل سے ہے۔ مثلاً "وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ" یعنی نبی کریم ﷺ کی مجلس میں چیخ کر نہ بولو۔ جیسے اعراب بولتے تھے، جیسے " وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ " یعنی جو گناہ شرک سے کم درجہ کا ہوگا اسے بخش دے گا۔

" وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ " ۔ یعنی تھوڑا عذاب جو ورے ہے اس بڑے کے۔

" ثم صلى ركعتين و هما دون اللتين قبلهما " یعنی پھر دو رکعتیں ادا

فرمائیں جو کہ پہلی دو رکعتوں سے کم طویل تھیں۔ غرض ثابت فقہا نے جہر کو کیا جو چیخ بولنے سے ذرا کم ہوتا ہے۔

سنن ابی داؤد ص ۲۶۳ میں ہے" فان افتانا بفتیا دون الرجم قبلناها " یعنی اگر انہوں نے فتویٰ دیا رجم سے کم سزا کا تو ہم اس کو قبول کر لیں گے (اسعد الطلباء صفحہ ۱۶۸) وغیرہ۔ غرض یہ کہ جہر مفرط کی نفی ہے۔ مطلقاً جہر کی نفی نہیں۔

(ف) حضرت عبداللہ ذوالبجادین تو حضور نبی کریم ﷺ کے سامنے ذکر جہر کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے شکایت بھی کی کہ یہ شخص ریاکار ہے۔ فرمایا: " انه من الاواهین " اور خود حضرت عمرو بن عبسہؓ کے ایمان کے واقعہ میں رات کے وقت نبی کریم ﷺ کا لا اله الا الله کا کعبہ میں بلند آواز سے ذکر فرمانا آیا ہے۔ کعبہ شریف تو مساجد میں افضل ہے۔ کتب سیرت میں مصرح ہے۔ فرمایا بزازیہ میں کلام مضطرب کیا ہے اور شامی میں تفصیل کی ہے۔ مختصر المعانی میں ہے ص ۱۸۵:

"معنی دون فی الاصل ادنی من الشئی یقال دون ذاک اذا کان احط منه قلیلاً"۔ ترجمہ: "دون اصل میں کسی شئی کا کم درجہ کا ہونا"۔ "هذا دون ذاک" وہاں بولتے ہیں جب وہ شئی دوسری کی نسبت سے تھوڑی سی کم ہو"۔

لاہور میں ایک شخص کو تلقین ذکر کرتے وقت زور سے ضرب لا الہ الا اللہ کی لگا کر دکھائی۔ دیوبند میں احقر جن حضرات کو بیعت کی غرض سے لے جاتا تھا، جہر سے ذکر کرنا تلقین فرماتے تھے۔ (انوار انوری ص ۹۴ تا ۹۵)

قلم و قرطاس دنیا کی پیدائش سے پہلے ہی علم کی حفاظت و اشاعت کا ذریعہ بن چکے تھے۔ قلم ہی ہے جس کے ذریعے سے جہالت کو ختم اور ہدایت کو عام کیا جا سکتا ہے۔ دعوت و تبلیغ، دین کی نشر و اشاعت اور اہل باطل سے مقابلے کے لئے زبان و قلم کا سہارا لینا

ناگزیر ہے۔ زبان و قلم ہی وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعے سے باطل کو سرنگوں اور حق کو بلندی کے مقام تک پہنچا سکتے ہیں، لیکن یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے مستحق دراصل علماء ہی ہیں اور یہ علماء کا فرض منصبی رہا ہے۔ ہمارے اکابر نے اس موضوع پر کافی کام کیا ہے۔ حضرت امام کشمیریؒ بھی اصلاح انقلاب اُمت کے داعی اور محرک تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اسلامی علوم کے وارث تھے، ان کے پاس خلوص تھا، قناعت تھی، زہد تھا، تقویٰ و خشیت الٰہی تھی، قیام لیل تھا، جس سے ان کی ہر بات، ہر لفظ، ہر ادا اور ہر نگاہ صاعقہ فگن تھی۔ اس کے برعکس آج ہم میں نہ وہ روح اعمال ہے نہ جذب و کشش، نہ تصنیف تالیف کا ذوق ہے نہ تحریر و تقریر کا ملکہ، نہ تحقیق ہے اور نہ ذوق مطالعہ۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ......

اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ کردار قاہرانہ

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ

☆☆☆☆☆☆ ☆

باب : ٦

ذوقِ شعر و ادب، افادات و ملفوظات

شعر کی تعریف اس کے اجزائے ترکیبی اور محاسن و معائب کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ لکھا جاتا رہے گا۔ شعر کا تعلق دل سے ہے اور دل بھی دل گداختہ۔ شعر تخیل کی معراج ہے اور یہ معراج ہر کس و ناکس کے حصے میں نہیں آتی، یہ وہبی ملکہ ہے اکتسابی نہیں۔

فرمودات اور تعامل نبوی ﷺ کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مطلق شعر کوئی نہ قابل مذمت ہے نہ قابل مدح۔ جس شاعری کے ذریعے رب ذوالجلال اور محمد عربی ﷺ کی عظمت کا سکہ دلوں پر بٹھایا جائے اور دین کے تقاضوں سے روشناس کرایا جائے اور دشمنان دین کے ناپاک عزائم کا جواب دیا جائے، یہ شاعری نہ صرف محمود ہے بلکہ اہم ترین فریضہ حق کی ادائیگی ہے۔ ہمارے بزرگ اسی قسم کے صاف ستھرے شعری ذوق کے مالک تھے۔

ذوق شعر و ادب :

حضرت امام کشمیریؒ کو بھی اپنے اکابر و اسلاف کی طرح ادبی ذوق اور سخن فہمی میں اعلیٰ درجے کا کمال حاصل تھا۔ ان کی شاعری عام شاعری نہ تھی۔ وہ عام شعراء سے ہٹ کر اپنے طرز کے اپنے انداز کے اپنی قسم کے اور اپنی شان کے نرالے شاعر تھے۔

اشعار کا خزانہ :

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رقمطراز ہیں :

ان کی عادت یہ تھی کہ عربی زبان کے کسی مشکل لفظ کی تشریح کرتے ہوئے یا کسی اور ضرورت سے، عربی شعر پیش کرنا چاہتے تو گو شہادت کے لئے ایک مصرعہ یا ایک شعر ہی کافی ہوتا، لیکن یادداشت کی بے پناہ قوت کا نتیجہ تھا، ایک مصرعہ کے لئے بیس بیس پچیس پچیس بلکہ اس سے بھی زیادہ اشعار کی نظموں کو مسلسل سناتے چلے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہم طالبعلموں کی حیثیت ٹھیک ان بھینسوں کی ہوتی تھی، جن کے سامنے بجانے والے بین باجہ بجا رہے ہوں اور غریب بھینس ٹک ٹک اس کو دیکھ رہی ہو، دوسروں کے متعلق تو مجھے کہنے کا حق نہیں، لیکن فقیر کی حیثیت تو اس وقت اخفش کے "بز" ہی کی ہوتی تھی۔ اپنی یافت اور سمجھ کے مطابق، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، شاہ صاحبؒ کی تقریروں کو میں مسلسل نوٹ کرتا چلا جاتا تھا، لیکن انشاء و شعر کا یہ جذبہ شاہ صاحبؒ پر طاری ہوتا تو میرے قلم اور انگلیوں کو آرام کرنے کا قدرتی موقع مل جاتا۔ اسی لئے میری مرتبہ تقریر شاہ صاحبؒ کے ان سنائے ہوئے اشعار سے خالی تھی، شاید چند ضروری مصرے یا شعر مشکل ہی سے اس سلسلہ میں قلم بند ہوئے ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ مجموعی طور پر نصف لاکھ یعنی چالیس پچاس ہزار سے کم تعداد ان عربی اشعار کی نہ ہوگی، جو شاہ صاحب کو زبانی یاد تھے، جنہیں جس وقت جی چاہتا وہ سنا سکتے تھے۔ (احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے چند دن ص ۱۰۳)

اردو شاعری کا ایک نمونہ:

حضرت امام کشمیریؒ عارف و صوفی تھے۔ ادیب تھے، شاعر تھے۔ عام طور پر عربی میں اشعار کہتے تھے، کبھی کبھی فارسی میں بھی مشق سخن فرمایا کرتے تھے۔ بڑے بڑے علماء اور معاصر شاعران کا ادب و احترام کرتے تھے۔ خصوصاً علامہ اقبال تو ان کے مداح تھے۔ اردو زبان میں حضرتؒ کی شاعری زیادہ مشہور نہیں۔ حضرت کے مخلص دوست منشی محمد دین

نے جو حضرت سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے، اپنی کتاب تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم میں حضرت امام کشمیریؒ کی ایک اردو نظم جو دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں ہے، نقل کی ہے۔ یہ نظم حضرتؒ کی شاعری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس نظم کے اشعار سے قارئین بھی حظ وافر حاصل کریں۔

سفر کی منزل ہے دار دنیا' ذرا تو اس کا خیال سا کر
سدا نہیں ہے یہ دیس تیرا' ضرور جانا ہے دن نبھا کر
کبھی تامل سے داہنے بائیں' آگے پیچھے کو دیکھ لیتا
کدھر کو جاتے ہیں دوست پیارے' کہاں وہ رہتے ہیں یاں سے جا کر
وہ چل بسے سارے باری باری' یہ باقی خلقت بھی چل بسے گی
تو چشم عبرت سے دیکھ غافل' کبھی تو اپنی نظر اٹھا کر
چلے ہی جاتے ہیں قافلے سب یہاں کا ٹھہرا ہوا ہے یہ ڈھب
کسی کا آنا کسی کا جانا' کبھی نہا کر کبھی رلا کر
کبھی نکل کر تو جنگلوں میں' خدا کی قدرت کا دیکھ جلوہ
کہیں ہے اونچا کہیں ہے نیچا' کہیں اندھیرا ہے جگمگا کر
کسی کا اقبال زور پر ہے' کسی پہ ادبار چھا رہا ہے
کوئی ہے آتا کما کما کر' کوئی ہے جاتا لٹا لٹا کر
کوئی ہے دکھیا کوئی ہے سکھیا' کوئی ہے خنداں کوئی ہے گریاں
یہ غمزدہ غم گھٹا گھٹا کر' وہ خوش ہے خوشیاں منا منا کر
غرض یہاں ہیں سب آتے جاتے' دن اپنے اپنے بھرتے جاتے
نہیں ہے رہنا یہاں کسی کو' کہ کوچ اک دن ہے سب چلا کر

اگر ہوں اعمال اپنے اچھے بُری نہیں ہے یہ زندگانی
فرشتے اعمال نیک والے نکال لیں گے بچا بچا کر
نماز پڑھنا، قیام کرنا، رکوع کرنا، سجود کرنا
کبھی کھڑے ہو کے گاہ جھک کر زمین پہ ماتھا ٹکا ٹکا کر

فارسی نعتیہ قصیدہ:

حضرت امام کشمیریؒ نے اپنی تصنیف عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام کے آخر میں مدح رسول کریم ﷺ کے حوالے سے ایک نعتیہ قصیدہ بھی شامل کیا ہے۔ قصیدہ کے الفاظ پڑھتے جائیے اور سر دھنتے جائیے۔ پورا لطف تو اس کو میسر ہو سکتا ہے جو خود عشق رسول ﷺ کی شاہراہ کا مسافر ہو۔ بطور نمونہ اور بطور تبرک ہدیۂ قارئین ہے:

دوش چوں از بے نوائی ہم نوائے دل شدم
عہد ماضی یاد کردہ سوئے مستقبل شدم
از سفر وا ماندہ آخر طالب منزل شدم
کز تکاپو سو بسو شام غریباں در رسید

دشت و گلگشت و بہارستان و خارستان ہم
فکر و ہم ہمدم نفس اندر قفس زاد رہم
پیش و پس بانگ جرس از کارواں در ہر قدم
دیدۂ عبرت کشودم غلغلے نامد پدید

تا سروش غیب از الطاف قدیم یاد کرد
رحمت حق ہم چو من درماندہ را امداد کرد
ما من خیر الوریٰ بہر نجات ارشاد کرد
مقصد ہر طالب حق آں مراد ہر مرید

قبلۂ ارض و سما مرآت نور کبریا
سید و صدر علیٰ شمس ضحیٰ بدر دجیٰ
شافع روز جزا وانگہ خطیب انبیاء
صاحب حوض و لوا ظل خدا روز عتید

صاحب خلق عظیم و مظہر جود عمیم
آیت رحمت کہ شان او رؤف است و رحیم
رحمۃ للعالمین خواندش خداوند کریم
خلق و خُلق و قول و فعل و ہدی و سمت او حمید

وسعت او بیضا ضیا اجود تر از باد صبا
حبذا وقت عطا ابر سخا آب بقا
وقت امر عالمے بر ضحک آں رحمت لقا
عام اشہب از جمال طلعتش صید سعید

داغ مہر او چراغ سینۂ اہل کمال
شور عشقش در سر عمار و سلمان و بلال
ثبت بر ایمائے وے نعمان و مالک بے خیال
ولہ آثار وے معروف و شبلی بایزید

از حدیث وے ہمہ دریوزۂ اہل اثر
مسلم و مثل بخاری وقف بر وصل سحر
سنت بیضائے وے نور دل ہر باصر
اتقیاء را اسوۂ اقدام وے تقلید جید

سید عالم رسول و عبد رب العالمین
آں زماں بودہ نبی کآدم بُد اندر ماء و طین
صادق و مصدق وحی غیب و مامون و امین
در ہر آں چیزے کہ آوردست از وعد و وعید

منبر او سدرۃ و معراج او سبع قباب
در مقام قرب حق بر مقدم او فتح باب
کاندرانجا نور حق بود و نبد دیگر حجاب
دید و بشنید آنچہ جز وے کس نشنید و ندید

مدح حائش رفع ذکر و شرح و صفش شرح صدر
او امام انبیاء صاحب شفاعت روز حشر
ہمگناں زیر لوایش یوم عرض و نیست فخر
سید مخلوق و عبد خاص خلاق مجید

آمیز و خیر والوری خیر الرسل خیر العباد
قدوۂ اہل ہدایت اسوۂ اہل رشاد
محو از ہمت او خلق را زاد معاد
عالم از رشحات انفاس کریمش مستفید

انتخاب دفتر تکوین عالم ذات او
برتر از آیات جملہ انبیاء آیات او
مشرق صبح وجود ما سوا مشکوٰۃ او
مستنیر از طلعت او ہر قریب و ہر بعید

دین او دین خدا تلقین او اصلی ہدیٰ
نطق او وحی سما حقا نجوم اہتدا
صاحب اسرار او ناموس کبریا برملا
علم او از اولین و آخرین اندر مزید

مولدش ام القریٰ مدفنش بشام آمد قریب
خاک رہ طیبہ از آثار وے بہتر زطیب
شرق و غرب از نشر رہن مستطابش مستطیب
افتش خیر الامم برا نعتاں بودہ شہید

خاص کردش حق باعجاز کتاب مستطاب
حجت و فرقان و معجز محکم و فصل خطاب
نجم مجبش در براعت ہست برتر ز آفتاب
حرف حرف او شفاہست و ہدیٰ بہر رشید

الغرض از جملہ عالم مصطفیٰ و مجتبیٰ
خاتم دور نبوت تاقیامت بے مرا
افضل و اکمل ز جملہ انبیاء نزد خدا
نعت اوصاف کمال او فزوں تر از عدید

تاصبا گلگشت گیہاں کردہ می باشد مدام
بوئے گل بردوش وے گردد بعالم صبح و شام
باد بروے از خدائے وے درود و ہم سلام
نیز بر اصحاب آل و جملہ اخیار عمید

وز جناب وے رضا بر اقتران مستہام
خامہ آں انور کہ افقر ہست از جملہ انام
مستغیث است الغیاث اے سرور عالی مقام
در صلہ از بارگاہت در کشید ایں قصید

ردّ قادنیت میں عربی اشعار:

طوالت سے بچنے کے لئے امام کشمیریؒ کے ردّ قادیانیت سے متعلق عربی اشعار سے انتخاب باب "عشقِ رسول ﷺ اور ردّ قادیانیت کا تعاقب" میں نقل کر دیا گیا ہے۔

قارئین وہاں ملاحظہ کریں۔

عالمِ برزخ و تشکلِ اعمال:

ور بعد سیر و فرجے کشف نہ شد حقیقتے
گر بودم فرشتے از پس مرگ ساعتے
رہگذر تنگ ندید دیدہ درمیں گذر
تاند گشت صورتے جلوہ نزد حقیقتے
وانہ خلاف تخم نے ہرچہ بود ز جبر و قدر
ظاہر و باطن اندراں ہمچو نواۃ و نخل دان
رشتہ ایں جہاں تن جامۂ آنجہاں تن
ہست عمل جزا ہماں آنچہ وانۂ ستاں
ہست جزا ہمو عمل سم کہ خورد شود مرض
قبر کہ بود و وادرے سوئے جہان دیگرے
منکشف آنجہاں شود گرچہ دراں جہاں بود

گرچہ برنگ و بو بخانہ کو بکو
شرح دہم چناں بتو قصہ بقصہ ہو بہو
ورنہ خاک خفتہ جو دشت بدشت سو بسو
قید و گلستن ہمو رنگ برنگ بو بو
آنچہ کشتہ درو خطہ بخطہ جو بجو
نے بعد او یک زر و جب بجب وو بدو
رشتہ برشتہ پیچ پیچ تار بتار پو بپو
باز رسد بطور نور و تو بکار دہم درو
بیخ و شجر ہموں ہموں تخم و ثمر چنو چنو
قیب شود شہود از دیدہ بدیدہ رو برو
زندگی دگر چنو ذرہ بذرہ مو بمو

مردن ایں طرف بود زیستن دگر طرف   روزن باز دید تو طبقہ بجنبہ تو بتو

انقہ اگر ز خود گذر کردہ بدے دریں سفر

زیستن ابد بداد تازہ بتازہ نو بنو

(منقول از "معارف" …)

افادات وارشادات :

جس شخص نے بھی ایک مرتبہ حضرت امام کشمیریؒ کا کلام سُن لیا یا پڑھ لیا وہ ان کے کلام کا عاشق اور گرویدہ ہوگیا۔ اشعار کی طرح نثر میں بھی حضرت امام کشمیریؒ قادر الکلام تھے۔ آج حضرتؒ ہم میں موجود نہیں لیکن ان کے اشعار، اقوال، ارشادات اور افادات ہمارے لئے ان کی صحبت کا بدل ہیں ۔

اے عارفؔ اپنے دل پُر شوق کی باتیں
اچھا ہے کہ تو اپنی زباں ہی سے سنائے
کیا جانے کوئی کاشف اسرار محبت
پھر محفل احباب میں آئے کہ نہ آئے

گستاخ رسول ﷺ کے کفر پر اجماع :

کل اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نازیبا الفاظ کہنے والا کافر ہے اور جو شخص اُس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے"۔

(اکفار الملحدین فی ضروریات الدین ص ۴۳)

فلسفۂ قدیم وجدید :

فلسفۂ قدیم ابعد عن الاسلام ہے اور فلسفۂ جدید اقرب الی الاسلام ہے۔

حق تعالیٰ کی مشیت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جن عقلاء زمانہ نے اسلامی چیزوں معجزات،

روحانیت وغیرہ کا انکار کیا تھا، ان ہی کے فلسفہ، ریسرچ اور تحقیقات سے وہ سب چیزیں دنیا والوں کے لئے ثابت ومشاہد ہو جائیں۔

(چنانچہ روح اور روحانیت کا اقرار وہ کر چکے، خوارق وعادات بھی تسلیم ہو چکے جن سے معجزات اسلام کا استبعاد عقل ختم ہوا۔

قرآن مجید میں ہے کہ اہل جنت واہل جہنم آپس میں ایک دوسرے کو دیکھیں گے، پہچانیں گے اور باتیں کریں گے، حالانکہ ان کے درمیان بہت غیر معمولی فاصلہ ہوگا، تو اب ٹیلیفون، ٹیلیگراف، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجادات نے اس کو بھی قریب عقل ومشاہدہ کیا ہے۔

اصوات واعمال کا ریکارڈ مستبعد سمجھا جاتا تھا، مگر گراموفون کی ایجاد نے اس سے بھی مانوس کر دیا کہ حق تعالیٰ نے زمین اور اس کے متعلقات میں بھی اخذ وریکارڈ کا مادہ ودیعت فرما دیا تھا جس کو ہم یورپ کی ان ایجادات سے پہلے عقل ومشاہدہ کی رو سے نہ سمجھ سکتے تھے) (نفحۃ العنبر حصہ اوّل ص ۱۹۱ از مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری)

آخرت میں اعمال کا ثمرہ :

آخرت میں اعمال کا ثمرہ جو ملے گا، وہی عمل ہوں گے۔ ان کی ایک صورت ہے عالم دنیا کی اور دوسری عالم آخرت کی، عمل ایک ہی ہے لیکن مکان کے اعتبار سے فرق ہے کہ وہی عمل وہاں جزا کی صورت میں ہوگا اور اس کی دلیل آیت قرآنی وَ وَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ہے۔ جس کے ایک معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ ملے گا، لیکن میں کہتا ہوں کہ بعینہٖ اپنے کئے ہوئے اعمال ہی کو آخرت میں موجود پائیں گے اور یہ مفہوم دوسری آیت واحادیث سے بھی مؤید ہوتا ہے۔ (نفحۃ حصہ اول ص ۹۰)

شیخ ابن عربی کا کشف :

حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کا کشف ہے کہ "محشر میں پیشی کے وقت داہنی طرف اللہ اکبر بائیں طرف سبحان اللہ، پچھلی طرف الحمد للہ اور سامنے سے لا الٰہ الا اللہ یہ چاروں کلمات رفیق ہوں گے"۔

یہ ترتیب اسی لئے ہے کہ اللہ اکبر اعلان کی چیز ہے۔ چنانچہ نعرۂ تکبیر جہاد وغیرہ میں ہے اور یہ کہ علم جہاد بھی داہنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لہٰذا داہنی جانب مناسب ہے۔

سبحان اللہ تسبیح ہے، نقائص و عیوب سے اور صفتِ سلبی ہے۔ لہٰذا ڈھال کی جگہ (بائیں طرف) مناسب ہے۔ الحمد للہ یہ آخر میں اور ہر کام کے پیچھے ہوا کرتا ہے، جیسے کھانے کے بعد اور ترازو میں بھی آخر میں ہوگا، لہٰذا پیچھے ہونا مناسب ہے اور لا الٰہ الا اللہ چونکہ ہادی اور راہنما ہے، اس کا سامنے ہونا مناسب ہے۔ (نطق انور حصہ اول ص ۹۲)

حضرت آدم علیہ السلام کی وجہ خلافت :

حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کی وجہ علم زیادہ ہونا ملائکہ سے بتلایا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک چونکہ حضرت آدم کی خلقت ہی میں عبدیت زیادہ تھی بہ نسبت ملائکہ کے اس لئے وہ خلافت سے سرفراز ہوئے ہیں، کیونکہ خلافت عطا فرمانے کی بات اور اس پر ملائکہ کی طرف سے عرض و معروض پہلے ہی ہو چکی تھی، پھر جب یہ مکالمہ (یا مناظرہ) ختم ہو چکا تو حق تعالیٰ نے ایک کرشمہ بھی دکھایا کہ حضرت آدمؑ کو علم عطا فرما کر ظاہر میں حجت بھی قائم فرمادی یعنی ارشاد خداوندی عطاءِ منصب خلافت پر ملائکہ نے بنی آدم کے ظاہری احوال سے "سفک دما" و "فساد فی الارض" کا اندازہ لگا کر جو بے محل سوال کر دیا تھا، حق تعالیٰ نے صرف اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ فرمادیا اور فرشتے بھی اپنے بے محل سوال پر نادم

ہوگئے، پھر بعد کے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ حضرت آدمؑ نے ہر موقع پر جناب باری میں نہایت عاجزی، غایت تذلل اور تضرع و ابتہال ہی کا اظہار کیا اور کوئی بات بھی بجز عبودیت کے ظاہر نہ فرمائی۔ حالانکہ وہ بھی حجت و دلیل اور سوال و جواب کی راہ اختیار کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ سے مناظرہ ہوا تو حضرت آدمؑ نے ایسی قوی حجت پیش فرمائی کہ حسب ارشاد نبی کریم ﷺ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے۔ ظاہر ہے کہ یہی دلیل وہ حق تعالیٰ کی جناب میں بھی پیش کر سکتے تھے، مگر وہاں ایک حرف بھی بطور عذر گناہ نہیں کہا، بلکہ اس کے برخلاف اپنے قصور ہی کا اعتراف فرما کر مدت دراز تک توبہ و استغفار، عجز و نیاز اور گریہ و زاری میں مصروف رہے۔ میرے نزدیک یہی عبودیت اور سراپا طاعت و نیازمندی کا وہ مقام تھا جس کی وجہ سے حضرت آدمؑ خصوصی فضیلت اور خلعتِ خلافت سے سرفراز ہوئے ہیں، پھر اس کے بعد جو حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے وصفِ علم کو اس موقع پر نمایاں کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کا وصف ظاہر تھا، جس کو سب معلوم کر سکتے تھے اس لئے نہیں کہ وہ مدارِ فضیلت تھا، بخلاف وصفِ عبودیت کے کہ وہ مستور و پوشیدہ وصف تھا، جس کو معلوم کرنا دشوار تھا۔ الخ۔ (نطق حصہ اول ص ۱۲۶، ۱۲۷)

امام محمدؒ :

امام شافعیؒ چونکہ فقیہ النفس تھے، اس لئے انہوں نے امام محمدؒ کی کماحقہٗ تعریف کی ہے، کبھی فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ دل اور نگاہ دونوں کو بھر دیتے ہیں (کیونکہ خوب صورت تھے اور علم بھی اچھا تھا) کبھی فرماتے ہیں کہ جب امام محمدؒ گفتگو کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وحی نازل ہو رہی ہے، ایک بار فرمایا کہ میں نے ان سے دو اونٹوں کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا۔

جہاں تک محدثین کی بات ہے تو ان میں جو لوگ فقیہ نہیں ہیں، ان کو امام محمدؒ کی قدر

ومنزلت معلوم نہیں، اس لئے ان لوگوں سے امام محمدؒ کے بارے میں تعریفی کلمات منقول نہیں ہیں۔ محدثین کی ناپسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ امام محمدؒ پہلے شخص ہیں جس نے فقہ کو حدیث سے الگ کیا۔ اس لئے ان لوگوں نے اس بارے میں ان کو مطعون کیا، حالانکہ آخر کار تمام مذاہب والوں کو ان کی اتباع کرنی پڑی اور سب نے انہیں کا طریقہ کار اختیار کیا۔

(فیض الباری ج ۱ ص ۱۵۲-۱۵۳)

حدوثِ عالم کا منکر کافر ہے:

حافظ ابن تیمیہؒ نے فرمایا کہ فلاسفہ میں سے کوئی بھی عالم کے قدیم ہونے کا قائل نہیں ہے۔ افلاطون بھی عالم کو حادث کہتا تھا، یہاں تک کہ سوائے زمانہ ارسطو آیا اس نے عالم کے قدیم ہونے کا اعتقاد قائم کیا لیکن یہ اعتقاد بالکل غلط ہے۔ اس کا قائل کافر ہے۔

تمام آسمانی مذاہب بھی عالم کے حادث ہونے پر متفق ہیں۔ ہاں بعض صوفیاء کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے بعض چیزوں کو قدیم مانا ہے۔ مثلاً شیخ اکبرؒ، علامہ شعرانی شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ عبارتیں بعد کی ملائی ہوئی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ شیخ اکبر بعض مسائل میں منفرد ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فرعون کے ایمان کا اعتبار کر لیا ہے، اگر اس نے توبہ کی ہوگی تو اس کو اس کے اعمال کی سزا ملے گی۔ مگر شیخ اکبر کے نزدیک وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رکھا جائے گا۔ بحر العلوم نے شیخ اکبر کی طرف بعض اشیاء کے قدیم ہونے کو منسوب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نسبت صحیح ہے لیکن دوانی نے ابن تیمیہؒ کی طرف عرش کے قدیم ہونے کی جو نسبت کی ہے یہ درست نہیں ہے۔ (فیض الباری ج ۱ ص ۱۰۶)

ابن سینا کی اصطلاحِ حدوث ذاتی:

جان لو کہ فلاسفہ میں کوئی حدوث ذاتی کا قائل نہیں تھا۔ ابن سینا نے آ کر یہ اصطلاح ایجاد کی اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام اور فلسفہ کے درمیان بیچ کا راستہ نکال لے۔

فلاسفہ یونان افلاک اور عناصر کو شخصی طور پر قدیم مان رہے تھے اور موالید ثلثہ (جمادات، حیوانات، نباتات) کو نوعی اعتبار سے قدیم مانتے تھے۔ میں نے اپنے رسالہ میں اس عقیدہ کے بطلان کو واضح کیا ہے۔ ابن رشد نے تہافت التہافت نامی ایک کتاب لکھی ہے، جس کے اندر امام غزالیؒ پر اعتراضات کئے ہیں۔ میں نے غزالیؒ پر کئے گئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ایک رسالہ لکھا ہے، مگر اب تک اس کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ میرے خیال میں ابن رشد ابن سینا سے زیادہ ماہر ہے اور ارسطو کا کلام ابن سینا سے زیادہ سمجھتا ہے۔

(فیض الباری ج ۱ ص ۱۶۶)

اگر آدمی صحیح بصیرت کے ساتھ احادیث میں غور و فکر کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اکثر و بیشتر احادیث قرآن کے اجمال کا بیان اور اس کے اشارات کی توضیحات ہیں بلکہ کثرت سے ایسی ہیں جن میں تعبیرات قرآنی کے لطیف اشارے ملتے ہیں۔

(مقدمہ مشکلات القرآن ص ۱۹)

قرآن کا اسلوب خطیبانہ ہے:

حضرت امام کشمیریؒ کی رائے تھی کہ قرآن کا اسلوب تالیف و ترتیب کا نہیں بلکہ خطیبانہ اسلوب ہے۔ جو سامعین کا لحاظ رکھتا ہے اور حسب موقع گفتگو کا رخ بدلتا رہتا ہے، کیونکہ عرب کا مزاج ایسا ہی تھا، آپ کا کہنا تھا کہ قرآن واقعات کی کھتونی اور حیات و ممات کا رجسٹر نہیں بننا چاہتا، بلکہ اس کا مقصد تذکیر و نصیحت اور عبرت و موعظت ہے، اس لئے واقعات کا بھی اسی حد تک ذکر کرتا ہے اور اجمال و تفصیل سے کام لیتا ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ قرآنی بیانات کی تکرار قند مکرر کا لطف دیتی ہے۔ اسی لئے قرآن خود اپنی تفسیر و تشریح بھی کرتا ہے۔ جس سے موضوع کی اہمیت بھی کھل جاتی ہے۔ جیسے نماز کا ذکر ۹۰۰ مرتبہ سے زیادہ آیا ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ (صاحب نظام القرآن) کی طرح شاہ صاحب بھی ربط آیات اور قرآن مکمل، منظم اور مربوط ہونے کے قائل تھے۔ فرماتے تھے کہ

ہم اپنی کم فہمی سے وہ ربط نہیں سمجھ پاتے، مگر فقہاء کے مرتب کلام کی طرح ہر بات کسی اصل اور قاعدے کے تحت ہوتی ہے۔ نسخ قرآن کے وہ قائل نہ تھے۔ سیوطی بیس آیتوں اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ پانچ آیتوں میں (نسخ کے) قائل ہیں، مگر ان کا کہنا تھا کہ بظاہر منسوخ آیتوں کا حکم بھی کسی نہ کسی طرح موجود ہے۔ وہ قرآن میں کسی زائد حرف کے بھی قائل نہ تھے، بلکہ ایسے حروف کو کسی مزید فائدہ پر مشتمل سمجھتے تھے۔ (مشکلات القرآن ص ۷۹، ۸۰)

رب ذوالجلال نے ابتدائے آفرینش سے ہی بنی نوع انسان کی فکری و روحانی تربیت اور رہنمائی کے لئے اپنے رجال کا سلسلہ شروع فرمایا جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا، تو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر اختتام پذیر ہوا۔ اب بھی ہر دور میں رب ذوالجلال رجال کار پیدا فرماتے ہیں اور فرماتے رہیں گے۔ فتنوں اور عریانی و فحاشی کے اس دور میں بھی ذاتی اغراض و مفادات سے بالاتر ہو کر دین متین کی سربلندی اور انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے والے موجود ہیں۔ ماضی قریب میں ایسے ہی ایک شخصیت حضرت امام کشمیریؒ کی تھی جو ہمارے اکابر و اسلاف کی تاریخ میں ایک مفکر و مصلح کے طور پر ایک منفرد اور ممتاز مقام کے حامل ہیں۔

حضرت امام کشمیریؒ کی تصنیفات، تالیفات، تحقیقات، خطابت، ارشادات، ملفوظات اور فرمودات میں درد و محبت، عشق و مستی، فکر آخرت، احترام انسانیت، ذوق و شوق مطالعہ اور اتباع سنت کا درس ملتا ہے، لیکن حضرت کی باتیں سمجھنے کے لئے وہی دل، حوصلہ، ذہن اور جذبہ چاہئے جو آج نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے ......

عارفی از بس ہیں نازک یہ رموز حسن و عشق
کون سمجھے گا یہ باتیں اور سمجھائے گا کون

☆☆☆☆☆☆☆

باب : ۷

رُخِ انور کی تابانیاں، حسنِ صورت و سیرت کا مرقع، دلبرانہ ادائیں و معصومیت، اتباعِ سنت کا اہتمام، خودداری و استغنا اور مخلوقِ خدا پر شفقت

شمائل ترمذی میں حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے:

ایک رات میں مسجد میں گیا۔ چاندنی رات تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سُرخ دھاری دار چادر اوڑھے ہوئے آرام فرما تھے۔ میں نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا رُخِ روشن دیکھا، پھر چاند کی طرف دیکھا میرے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور آسمان کے بدر کامل سے زیادہ روشن ہے ....

چاند سے تشبیہ دینا یہ بھی کیا انصاف ہے

اس کے منہ پہ چھائیاں مدنی کا چہرہ صاف ہے

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے، میں زیارت کے لئے حاضر ہوا، جب میں نے آپ کا چہرۂ انور دیکھا تو میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کسی جھوٹے شخص کا چہرہ نہیں ہے۔

ایک حدیث میں ہے: "ما بعث اللّٰہ نبیاً الا حسن الوجہ و حسن الصوت"۔ اللہ نے ہر نبی کو صورت وظاہر کی نورانیت وزیبائی عطا فرمائی سیرت وباطن کے کمال کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو حسن وجمال کی دولت سے مالا مال کردے تو مخلوق کو اس بندۂ خدا سے افادہ واستفادہ کا زیادہ شوق پیدا ہوتا ہے۔ فخر المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کو بھی اللہ نے حسن ظاہری کی دولت سے نوازا تھا۔

چہرۂ انور دیکھ کر ایک ہندو ایمان لے آیا:

ملتان چھاؤنی کے اسٹیشن پر فجر کی نماز سے قبل گاڑی کے انتظار میں حضرت مولانا

محمد انور شاہ صاحب تشریف فرما تھے۔ خدام کا اردگرد مجمع تھا، ریلوے کے ایک ہندو بابو لیمپ ہاتھ میں لئے ہوئے آرہے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا منور چہرہ دیکھ کر سامنے کھڑے ہوگئے اور زار وقطار رونے لگے اور ایمان لے آئے۔ کہنے لگے اس بزرگ کا روشن چہرہ دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ اسلام سچا دین ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

انور شاہ کا چہرہ دیکھتا رہوں :

حضرت شاہ صاحب ایک دفعہ کشمیر تشریف لے جارہے تھے۔ بس کے انتظار میں سیالکوٹ کے اڈے پر تشریف فرما تھے۔ ایک پادری آیا اور کہنے لگا کہ آپ کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے بڑے عالم دین ہیں۔ فرمایا نہیں، میں تو ایک طالب علم ہوں۔ مولانا ظفر علی خان حضرت کے چہرے کے عاشق تھے کہا کرتے تھے، جی چاہتا ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کے چہرے کو دیکھتا رہوں۔

مجسمہ معصومیت :

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی" حضرت شاہ صاحبؒ کے ابتدائی شاگردوں میں سے تھے۔ حضرت شاہ صاحب کو پہلی بار دیکھا تو فریفتہ ہوگئے۔ لکھتے ہیں: میری آنکھوں کے سامنے پہلی دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ معنوی معصومیت کو دیدہ اور مرئی قالب میں ڈھال کر کسی نے رکھ دیا ہے۔ آنکھوں میں معصومیت' چہرے پر معصومیت' لبوں میں معصومیت' از سرتاپا ہمہ تن معصومیت' حسن کردار کا مجسمہ' عفاف و استغنا' صفا قلب' تقویٰ کی ڈھلی ہوئی کوئی گڑیا' جو کچھ باہر میں ہے وہی سب کچھ اندر بھی ہے، نکھرا دھلا ہوا چہرہ و جسم

پر رونق و نضارت شادابی و تروتازگی کھیل رہی تھی۔ نثار ہورہی تھی۔ داڑھی کے بال حد سے زیادہ سیاہ و زردی مائل سرخی کی جھلک کے ساتھ روئے انور کے رنگ کا ایک جان بخش دل آویز نظارہ میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ حضرت الاستاذ الامام کا شباب کا زمانہ تو شاید تھا غالباً چالیس سے اس وقت عمر مبارک متجاوز ہوچکی ہوگی لیکن آب ورنگ کی تازگی وشادابی ایسی تھی کہ ہزار ہا ہزار شبابی مظاہر اس پر نثار تھے۔ (حیات انور ص ۳۲)

جمال انور :

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے لکھتے ہیں :

قدرت نے حضرت الاستاذ کو جس طرح اقلیم علم کی تاجداری عطا فرمائی تھی۔ اس طرح جسمانی وجاہت، ڈیل ڈول، قد وقامت اور شکل وصورت میں ایک خاص امتیاز عطا فرمایا تھا۔ مجھ کو ہندوستان' مصر وحجاز اور دوسرے ممالک عربیہ کے بڑے بڑے علماء اور مشائخ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے لیکن جو وجاہت' جو وقار ومتانت جو دلکشی اور جاذبیت میں نے حضرت الاستاذ میں پائی، وہ کہیں کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ ہزار علماء میں بھی بیٹھتے تو سب سے ہی الگ اور سب سے ہی نمایاں رہتے۔ دیکھنے والوں کی نگاہ ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہیں پر جاکر ٹھہرتی اور پھر جمتی تو اس طرح کہ وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتی۔ کشمیری النسل تھے، اس لئے خوب کھلا ہوا سفید رنگ، کشیدہ ودراز قامت، چوڑا چکلا سینہ، دوہرا اور گداز جسم، بڑی بڑی مگر رسیلی اور شربتی آنکھیں، کشادہ وفراخ پیشانی، طویل مگر ستواں بینی، بڑے بڑے کان، پُر گوشت اور فربہ چہرہ، ابریشم اور حریر کی مانند نرم وسبک جلد، چلتے تھے تو معلوم ہوتا کہ علم کا ایک کوہ گراں سبک گامی کر رہا ہے، بیٹھتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ علم وفضل کا ایک آفتاب نظام شمسی سے وابستہ ستاروں کو اپنے اردگرد لے کر بیٹھ گیا ہے، وہ بھی سفید

اور بھی سبز سر پر عمامہ اور قامت بالا پر سبز قبا، دیکھنے والے ڈر ڈر کے دیکھتے تھے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے کہ فرمان نبوی ہے، العین حق۔ (حیات انور ص ۱۹۸)

یہ جہاں فانی ہے کو چیز لافانی نہیں
پھر بھی اس دنیا میں انور شاہؒ کا ثانی نہیں

پہلی جھلک نے وارفتہ کردیا:

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رقمطراز ہیں:

آج سے تقریباً تیس (۳۰) سال پہلے کی بات ہے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور اگلے سال دارالعلوم دیوبند جانے کا ارادہ تھا۔ مرادآباد میں جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس ہوا۔ یہ عاجز بھی گیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا ذکر اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا لیکن ابھی تک آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ غالباً صبح کا وقت تھا۔ دیکھا کہ چند حضرات ایک طرف سے تشریف لا رہے ہیں، اُن میں ایک بزرگ جو گہرے سبز رنگ کا عبا پہنے ہوئے تھے اور غالباً ہلکے زرد رنگ کا عمامہ زیب سر تھا، بڑے حسین وجمیل اور بڑے نورانی نظر پڑے۔ آپ سے آپ دل میں آیا کہ شاید یہی دیوبند کے "حضرت شاہ صاحب" ہیں۔ کسی سے پوچھا جواب ملا کہ ہاں شاہ صاحبؒ یہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اس دید ہی سے دل میں ایک خاص محبت وعقیدت ڈال دی۔

اجلاس کے سلسلہ میں تین دن میں مرادآباد رہا۔ اب تک یاد ہے کہ اس تاک میں رہا کرتا تھا اور گھوم پھر کر بھی اس کی کوشش کیا کرتا تھا کہ حضرت کو کہیں دیکھوں۔ غالباً دیکھنا تو بار بار نصیب ہوا لیکن تقریر یا بات سننا کیا معنی، اُن دنوں میں آواز سننا بھی یاد نہیں۔

جی بھرتا نہیں تھا:

چند مہینے کے بعد دیوبند پہنچ گیا۔ اس سال چونکہ میں نے دورۂ حدیث نہیں لیا

تھا۔ اس لیے حضرت کے یہاں میرا کوئی سبق تو نہیں تھا، لیکن پھر بھی روزانہ کئی کئی بار آنکھوں کو دید کا موقع ملتا تھا۔ مگر خوب یاد ہے کہ جی بھرتا نہیں تھا اور ہر دفعہ دیکھنے میں لذت نئی تھی۔ اگلے سال میں نے دورہ لیا اور حسب معمول بخاری شریف اور ترمذی شریف پوری پوری حضرت کے یہاں ہوئیں اور ان دونوں سبقوں کے سلسلہ میں روزانہ قریباً تین چار گھنٹے خدمت میں حضوری کی سعادت ہوتی تھی، لیکن اپنی اس گذشتگی کے ذکر اور اس کی یاد میں آج بھی لذت محسوس کرتا ہوں کہ حسب توفیق علمی استفادہ کے علاوہ یہ عاجز آنکھوں کے ذریعہ بھی لذت وسرور حاصل کرتا تھا اور میرا خیال ہے کہ میں اس حال میں منفرد نہ تھا بلکہ بہت سے شرکاء درس غالباً میرے شریک حال تھے۔

کہیں نظر نہ لگ جائے:

دارالعلوم کے صدر مدرس مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ کہتے تھے کہ ایک بار جمعہ کے روز سردی کے موسم میں حضرت شاہ صاحب سبز پوشاک میں ملبوس دارالعلوم سے جامع مسجد کے لئے روانہ ہوئے۔ میری نظریں آپ پر پڑیں تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں حضرت شاہ صاحبؒ کو میری نظر نہ لگ جائے۔

حسن صورت کا منظوم منظر:

ضیاء الرحمان ضیا نے حضرت محدث کبیر مولانا محمد انور شاہ صاحب کے حسن صورت کی کیا خوب منظر کشی کی ہے

گلستان وادی لولاب کا تازہ گلاب
چہرۂ انور تھا شرح آئینہ نور و کتاب
تھا جبین پاک پہ سیمائے من اثر السجود
دیکھ کر حلقہ بگوش دیں ہوئے اہل جحود

دین کی حقانیت کا حجت وبرہان رہا
تھا فرشتہ اور گمان حضرت انسان رہا

حسن و رعنائی کی دلآویزی :

حضرت مولانا انظر شاہ صاحب رقمطراز ہیں :

حضرت شاہ صاحبؒ کو بواسیر کا مرض لاحق تھا۔ آخری عمر میں مرض کے غلبہ کے باوجود خوبی و رعنائی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مرض الوفات میں خون کا بڑا حصہ خارج ہو چکا تھا لیکن جب غسل دیکر کفن پہنایا گیا تو دونوں رخسار گلاب کے پھول نظر آئے۔ ہزاروں انسانوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مغفور و مرحوم ہونے کی اسے ایک علامت قرار دی۔ حسن و جمال، تناسب اعضاء، متوازن قد و قامت، پرتو علم اور نور ایمان مستزاد تھا۔ معصومیت، دلنوازی اور دلربائی ایک قدرتی اضافہ۔ یہ حسن اور کشش اس بلا کی موثر تھی کہ بعض غیر مسلم دیکھ کر بے اختیار ایمان لے آئے۔

(نقش دوام ص ۷۰)

حُسن صورت و سیرت کا جامع :

سیرت انور کے مرتب جناب مسعود احمد قاسمی صاحب لکھتے ہیں :

شاہ صاحبؒ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے حسن سیرت کے ساتھ ساتھ حسن صورت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اگر ایک طرف آپ علم کی ایک چلتی پھرتی لائبریری اور بحر ذخار تھے، تو دوسری طرف حسن و جمال میں بھی یکتا تھے، سفید کھلا ہوا رنگ، چوڑا چکلا سینہ، لمبا لیکن کشیدہ قد، بھرا ہوا جسم، فراخ کشادہ پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، نرم و نازک جلد۔

الغرض آپ حسن و جمال کا مرقع تھے۔ بڑے بڑے مجمع میں بھی لوگ آپ کو پہچان جاتے تھے کہ یہی سب سے بڑا عالم ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو ایک خاص جاذبیت عطا فرمائی تھی اور علمی و روحانی فیض کی شعاعیں آپ کے چہرۂ مبارک سے اس طرح ہویدا تھیں کہ جو کوئی ایک بار نظر بھر کر دیکھ لیتا پھر چہرۂ مبارک سے اپنی نظر نہ اٹھاتا۔ آپ بڑے حلیم اور کم گو تھے، بلاضرورت بات کرنے کے عادی نہ تھے اور یہی ایک عالم کی نشانی ہے کہ اس کی ہر بات سے وقار ٹپکتا ہے اور وہ بلاضرورت باتیں کرنا پسند نہیں کرتا۔ ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک شخص حسن سیرت اور حسن صورت دونوں میں یکتا ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحبؒ کو حسن سیرت اور صورت دونوں سے نوازا تھا۔ شاہ صاحبؒ کے علمی اور صوری محاسن کی بدولت ہر شخص آپ کی طرف کھنچا تھا۔ (سیرت انور ص ۳۲)

چہرے سے اسلام کی دعوت :

مولانا محمد علی مونگیری کی دعوت پر جب آپ مونگیر قادیانیت کی تردید کے لئے تشریف لے گئے اور چند روز تک اجتماع میں آپ کے مسلسل بیان ہوئے تو علاقہ کا ایک بڑا ہندو سادھو جوان اجتماعات میں پابندی سے شریک ہوتا رہا۔ آخری دن کہنے لگا کہ یہ شخص (حضرت شاہ صاحبؒ) اپنے چہرے سے اسلام کی دعوت دیتا ہے۔

سنتوں کا چلتا پھرتا نمونہ :

حُسن صورت عارضی چیز ہے اور حُسن سیرت مستقل اور دائمی کمال ہے۔ حُسن صورت اللہ کا انعام ضرور ہے لیکن مطلوب و مقصود نہیں۔ حُسن سیرت وہ عنصر ہے جس کو یہ دولت میسر آ گئی وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ٹھہرتا ہے۔ آج ہمیں امام ابو حنیفہؒ، امام

مالک، امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ، حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے اکابر سے محبت ہے تو محبت کی بنیادیں حُسن صورت پر نہیں حُسن سیرت پر استوار ہیں۔ حسن صورت اور حسن سیرت کا اجتماع سونے پہ سہاگے کا کام دیتا ہے۔ ربِ ذوالجلال نے محدث کبیر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کو حسن صورت کے ساتھ ساتھ اخلاق و کمالات اور اتباعِ سنت کی برکات سے مالا مال کر دیا تھا۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے لکھا ہے:

ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی سنتوں کی اصل کیفیت حضرت شاہ صاحب کو دیکھ کر سیکھتے تھے۔ رفتار مسنون انداز کی تھی۔ زمین پر نہایت ہی سبک قدم رکھتے، جس وقت چلتے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال کا منظر دکھائی دیتا جس کی کیفیت شمائل کی عام کتابوں میں صحابہؓ نے ''کانما ینحط الی صبب'' ۔ گویا کہ اوپر سے نیچے کو اتر رہے ہیں، کے ساتھ بیان کی ہے۔

چلنے میں بھی اتباعِ سنت کا اہتمام :

حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ فرماتے تھے:

میں میرٹھ میں پڑھتا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا نام سنا تھا، لیکن آپ کی زیارت کا اب تک موقع نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک روز میرٹھ میں اعلان ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کسی غیر مقلد عالم سے مناظرہ کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ مناظرہ محلّہ کی ایک مسجد میں جمعہ کے بعد ہونے والا تھا۔ میں بھی اپنے چند ساتھی طلبا کے ساتھ مسجد میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجمع پیچھے اور حضرت شاہ صاحب آگے آ گئے تھے۔ دور اور قریب سے دیکھا تو رفتار کانما ینحط الی صبب کی مظہر تھی۔

کھانے کے بعد ہاتھ کو تلوؤں پر ملنے کی سنت کا اہتمام :

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا بیان ہے کہ جب کھانا سامنے آتا تو تواضع کی ایک خاص کیفیت آپ پر طاری ہوتی اور ہر لقمہ کے بعد الحمد للہ پڑھتے رہتے، کھانے سے فراغت کے بعد دونوں ہاتھوں کو تلوؤں پر ملنے کا مسنون اہتمام علماء میں آپ ہی کے یہاں دیکھا۔ (سیرت انور ص ۸۲)

لباس :

جناب مسعود احمد قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

حضرت شاہ صاحبؒ پاجامہ استعمال کرتے تھے اور پاجامہ نیم ساق (پنڈلی) سے کبھی نیچا نہ ہوتا تھا۔ عمامہ کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔ سردیوں میں اکثر و بیشتر سبز یا سیاہ رنگ کا عمامہ استعمال فرماتے تھے۔

ہر ادا میں اتباعِ سنت کا اہتمام :

ہم بہت سی سنتیں حضرت شاہ صاحبؒ کے عمل کو دیکھ کر معلوم کر لیا کرتے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد تولیہ یا رومال سے ہاتھ پونچھنے کے بجائے ہمیشہ پاؤں کے تلوؤں سے ہاتھ پونچھ لیتے تھے۔ اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ کھانے میں ہمیشہ تین انگلیاں استعمال فرماتے تھے اور دونوں ہاتھ مشغول رکھتے تھے۔ بائیں ہاتھ میں روٹی اور داہنے ہاتھ سے اسے توڑ توڑ کر استعمال کرتے تھے۔ لقمے ہمیشہ چھوٹے استعمال کرتے تھے۔ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے جاتے تو فاسعو الی ذکر اللہ کا منظر سب کو نظر آتا۔ سعی اور دوڑ کی شان، تیز رفتاری اور لمبے لمبے قدم، ان کی چال سے نمایاں ہوتی تھی۔ حسبنا اللہ تکیہ کلام تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اکثر و بیشتر حسبنا اللہ فرماتے رہتے۔ ایسے ہی موقع بموقع اللہ

اَحلّ فرماتے رہتے۔ (حیات انور ص ۱۷۰)

بیوہ اور سیدہ سے نکاح کروں گا :

حضرت شاہ صاحبؒ کافی عرصہ تک نکاح اور شادی کرنے میں تاخیر کرتے ہوئے تجرد کی زندگی کو فوقیت دیتے رہے۔ جب حضرت شاہ صاحبؒ کی عمر تقریباً چوالیس سال کی ہوئی تو اکابر دار العلوم دیوبند حضرت حبیب الرحمٰن عثمانیؒ اور مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے مشورہ کر کے آپ کو نکاح کی ترغیب دی۔ جب رشتہ کی بات چلی تو حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ شرط لگائی کہ میں اُس عورت سے نکاح کروں گا جو سیدہ ہو اور بیوہ ہو۔ یہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر ازدواجی زندگی میں عمل کرنے کا اہتمام تھا، کیونکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت سے پہلے شادی کی تو آپ کے عقد میں حضرت خدیجہؓ آئیں جو سیدہ بھی تھیں اور بیوہ بھی تھیں، ایک جگہ شادی کی بات چلی، وہ عورت نجیب الطرفین سادات میں سے تھی، جب حضرت شاہ صاحب کو اُن کے متمول اور رئیس ہونے کا علم ہوا تو انکار کر دیا۔ بعد میں حضرت حکیم سید محفوظ علی کی ہمشیرہ سے نکاح ہوا۔ اس نکاح کی تفصیل شاہ صاحبؒ کے فرزند حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کے قلم سے نذر قارئین ہے۔

رفیقۂ حیات کا بچپن کا خواب :

والدہ مرحومہ نے بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ دو ترنجیں ہیں۔ ان پر ایک طوطا بیٹھا ہوا ہے۔ یہ طوطا دونوں ترنجوں کو بوسہ دے رہا ہے بلکہ بچپن میں یہ خواب بھی دیکھا کہ میری شادی ایک کہنہ سال آدمی سے ہوئی ہے، جس کا حلیہ ان کو ہمیشہ محفوظ رہا۔ فرماتی تھیں حضرت شاہ صاحبؒ کو پہلے لمحہ میں دیکھتے ہی اپنے بچپن کے خواب کی بھرپور تعبیر سامنے آ گئی۔ جب حضرت شاہ صاحب کا نکاح ہوا اور بارات بھوپال گئی تو والدہ ماجدہ

حضرت شاہ صاحب کا سن وسال ۴۵ سے متجاوز تھا اور ریش مبارک کا ایک تہائی حصہ سفید ہو چکا تھا۔ بارات پہنچی تو والدہ کے محلہ میں کہرام بپا ہو گیا کہ ۱۳ سال کی معصوم بچی ایک کبیر السن سے بیاہ دی گئی۔ جاہل عورتوں نے یہ داستان بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ والدہ تک بھی پہنچائی جو اس وقت دلہن بنی بیٹھی تھیں۔ والدہ مرحومہ بتاتی تھیں کہ اس بے جوڑ شادی کی تفصیلات سن کر میں کانپ اٹھی۔ نکاح کے بعد رخصتی ہوئی، جب والدہ مرحومہ کو اتارا گیا اور شاہ صاحب کے ساتھ زندگی کے شب و روز گذرے تو والدہ مرحومہ نے اپنے جذبات وخواہشات کو مرحوم کی خواہشات پر قربان کر دیا تھا۔

آغازِ ازدواج :

حضرت شاہ صاحب کی زندگی میں زہد وقناعت رسما نہیں بلکہ واقعیت کے ساتھ موجود تھی۔ شروع سے لے کر آخر تک ان ہی دو وصف پر زندگی قائم رہی۔ والدہ فرماتی تھیں کہ جس وقت شادی ہوئی تو سب سے پہلی ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی کہ

میں ایک مفلوک الحال اور غریب الوطن ہوں۔ تاہلی زندگی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ حضرت استاد شیخ الہند اور سیدو مہتمم صاحبان کے حکم پر یہ صورت اختیار کی ہے۔ گھریلو زندگی اور عائلی نظم وانتظام کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے پہلی بار جو جہیز یں الاثاثۃ البیت کے طور پر بہم پہنچائیں، وہ مٹی کا ایک بدھنا مٹی کے دو پیالے اور ایک چٹائی تھی۔ ایک مدت تک والدہ کے کھانے کا انتظام مولانا طیب صاحب کے مکان سے ہوتا رہا۔ البتہ صبح کا ناشتہ میں کبھی کبھی چائے اور مدرسہ کا کھانا حضرت والد صاحب بھیجتے۔ (نقش دوام)

خودداری :

زہد وقناعت کا ثمرہ خودداری ہی کی صورت میں بار آور ہوتا ہے۔ جب انسان کی

نظر میں مال و دولت کی اہمیت نہ ہو تو وہ بڑے سے بڑے مالدار حکمران اور کج کلاہ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ حضرت شاہ صاحب میں بھی خودداری کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ دہلی میں نظام حیدرآباد سر آصف خسروئے دکن آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ شاہ صاحب دیوبند سے دہلی تشریف لائے۔ نظام نے آپ کو فوراً اندر بلایا۔ شاہ صاحبؒ نے سیدھے سادے طور پر السلام علیکم فرمایا۔ نظام نے بڑی قدر و منزلت سے آپ کو خوش آمدید کہا۔ کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں، جو زیادہ تر علمی تھیں۔ اُن دنوں دیوبند سے ایک اخبار ''مہاجر'' نکلا کرتا تھا۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا' اخبار کے ایڈیٹر نے ملاقات کی خبر چھاپنی چاہی۔ شاہ صاحبؒ کو عنوان کی اطلاع دی گئی' جو مندرجہ ذیل تھا: ''بارگاہ خسروی میں علامہ کشمیری کی باریابی''۔

شاہ صاحبؒ کو یہ عنوان بالکل پسند نہ آیا، انہوں نے فرمایا، ہر چند کہ میں ایک فقیر بے نوا ہوں، مگر اتنا گیا گذرا بھی نہیں کہ اس طرح کے عنوانات برداشت کروں، کیسی بارگاہ خسروی اور کہاں کی باریابی۔ صرف اتنا لکھئے : ''نظام حیدرآباد سے انور شاہ کی ملاقات''۔ (سیرت انور ص ۸۶)

حکمرانوں سے استغناء :

نواب فیض الدین ایڈوکیٹ کی صاحبزادی کی شادی تھی۔ شاہ صاحب صرف شادی میں شرکت کی غرض سے حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں نے چاہا کہ شاہ صاحبؒ اور نظام کی ملاقات کرادی جائے۔ نظام بھی چاہتے تھے کہ شاہ صاحب کی ملاقات سے فیضیاب ہوں لیکن شاہ صاحبؒ نے ایک نہ سنی اور نظام سے ملنے کی درخواست کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں حیدرآباد صرف نواب فیض الدین صاحب کی لڑکی کی شادی میں شرکت

کے لئے آیا ہوں اور اس کے علاوہ اور کوئی مقصد اس سفر سے وابستہ کرنا نہیں چاہتا۔

چنانچہ آپ نے نظام سے ملاقات نہ کی۔ اسی طرح ایک مرتبہ سر اکبر حیدری نے شاہ صاحبؒ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ انہیں دنوں کا واقعہ ہے، جب شاہ صاحبؒ نواب فیض الدین ایڈوکیٹ کی صاحبزادی کے سلسلے میں حیدرآباد میں اُن کے مکان پر ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ شاہ صاحب نے جواب دیا، اُن سے کہہ دو کہ میں یہیں ہوں اگر انہیں ملنا ہو تو یہیں آکر مل لیں۔ سر اکبر حیدری نے گذارش کی کہ میں آنے کو تیار ہوں لیکن اگر تنہائی میں ملاقات ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ شاہ صاحبؒ نے سر اکبر حیدری کو کہلا بھیجا کہ یہ ناممکن ہے کہ میں اُن کی وجہ سے حاضرین مجلس کو اٹھ جانے کو کہوں یا خود مجلس سے اٹھ کر چلا جاؤں۔ (سیرت انور ص ۸۷)

دولت سے علم کی خرید :

حضرت مولانا انظر شاہ صاحب راوی ہیں کہ والد مرحوم سے بارہا سنا کہ مولانا محمد میاں سملکی (بڑے مالدار باپ کے بیٹے تھے) جب دیوبند میں پڑھتے تو میری ہمشیرہ راشدہ خاتون جن کی عمر اس وقت سات آٹھ سال کی تھی اور بچیوں کے عام دستور کے مطابق اپنی گڑیا کی تقریب شادی کے انتظامات میں مصروف تھیں۔ مولانا سملکی نے بازار سے کچھ بیش قیمت کپڑوں کے ٹکڑے گڑیا کے لئے خرید کر دیے۔ عصر کا وقت تھا، حضرت والد صاحب اس وقت معمولاً اپنے مخصوص کمرے سے باہر وضو کے لئے تشریف لائے۔ آپ وضو کر رہے تھے۔ ہمشیرہ کپڑوں کا یہ تحفہ لئے ہوئے سامنے سے گذریں، شاہ صاحبؒ نے اشارہ سے ، کر تحقیق حال کی اور معصوم بچی سے پوری کیفیت سننے کے بعد شدید غصہ کا اظہار فرمایا۔ الفاظ بعینہ یوں تھے کہ یہ صاحب کیا اپنی دولت سے ہمارا علم خریدنا چاہتے ہیں۔

بات کچھ بڑی نہ تھی، مجھے یقین ہے کہ عقیدت مند شاگرد کی نیت میں کوئی فتور نہ تھا مگر شاہ صاحبؒ جس غیر معمولی خودداری کی دولت سے سرفراز تھے یہ اسی کی ایک جھلک ہے۔

ارتباط اور تعلقات :

خودداری کے ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ آپ اس خودداری میں کسی تعلق کی بھی رعایت نہ کرتے تھے۔ ربط و تعلق کی رعایت جس طرح آپ کے یہاں موجود تھی، اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے ہوگا۔ جس کے راوی آپ کے برادر خورد مولانا سیف اللہ شاہ ہیں، کہتے ہیں۔ ایک بار عید الاضحیٰ کے بالکل قریب حضرت شاہ صاحبؒ کشمیر تشریف لائے، مکان پہنچنے سے پہلے اپنے پرانے و خصوصی متعلقین لکڑو خاندان کے ساتھ وقت گذارا۔ ادھر ادھر سے کچھ عزیز و اقارب پہنچ گئے، جن کی خواہش تھی کہ آپ عید گھر کریں۔ دوسری جانب لکڑو خاندان کا اصرار تھا کہ عید بارہ مولہ میں ہونا چاہئے۔ عید سے دو روز قبل بارہ مولا کے ایک گاؤں کے کچھ عقیدت مند آئے اور اپنی بستی میں چلنے پر اصرار کیا۔ عید بالکل قریب تھی۔ اس لئے آپ نے جانے سے انکار فرمایا۔ انہوں نے یقین دلایا کہ ایک رات کے قیام کے بعد صبح ہی بارہ مولہ واپس ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ بار بار کی اس یقین دہانی پر دل شکنی سے بچنے کے لئے بارہ مولہ سے اس گاؤں کی جانب روانہ ہوئے اور اگلی صبح کو وعدہ کے مطابق جب واپسی کا ارادہ فرمایا تو جیسا کہ عوام کی عادت ہے، گاؤں کی آبادی نے نہ صرف پروگرام کو لیت و لعل میں ڈالا، بلکہ اچھی خاصی مزاحمت پر آمادہ ہوگئے۔ آپ نے فرمایا بھائی میں بارہ مولہ میں عید کرنے کا وعدہ کرچکا ہوں، اب یہ مزاحمت کیسی ہے؟

اس پر ایک دیہاتی نے ذرا تلخ ہوکر کہا، آپ ہم غریبوں کی دعوت ٹھکرا کر

لڑکے بارہ مولہ کے رؤسا کی دعوت کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اس پر حضرت شاہ صاحبؒ برہم ہوئے اور فرمایا :

خدا کے بندے میں پرانے تعلقات کو چھوڑتا نہیں اور نئے مراسم کی تلاش کرتا نہیں۔ (نقش دوام ص ۹۲، ۹۳)

مہمان نوازی :

مہمان نوازی سنت انبیاء علیہم السلام میں سے ہے۔ خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت زیادہ مہمان نواز تھے۔ صحابہ کرام میں حضرت علیؓ کا پسندیدہ مشغلہ مہمان نوازی تھا۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ جو آدمی اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ اُسے چاہئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ حضرت شاہ صاحب حد درجہ کے مہمان نواز تھے کتابوں میں یہ روایات کثرت سے ملتی ہیں کہ سادات خاندان سخی اور مہمان نواز ہوا کرتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ تو نجیب الطرفین سید بھی تھے، عالم تھے، محدث تھے اور سب سے بڑھ کر محمد عربی ﷺ کے عاشق اور صحابہ کرامؓ کے محب تھے، اس لئے مہمان نوازی آپ کی فطرت ثانیہ تھی۔

اضیاف کا اکرام :

جناب محمد عنایت اللہ لکھتے ہیں :

ایک دفعہ غالباً ۱۳۲۸ھ بیروں کا موسم تھا اور احقر دیوبند حاضر ہوا۔ حضرت شاہ صاحبؒ بھی ڈابھیل سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت صحن میں چارپائی پر تشریف فرما تھے، مولانا مشیت اللہ صاحبؒ اور بہت سے مہمان بیٹھے تھے، کمال مہربانی فرمائی۔ ہمیں دیکھتے ہی چارپائی سے اٹھ کر ننگے ہی پاؤں ہماری طرف تشریف لائے اور مصافحہ

فرمایا، پھر مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری کے پاس تشریف فرما ہوئے اور ان کو بیر کے چھلکے اُتار کر عنایت فرما رہے تھے۔ ایک طبق ہماری طرف بھی رکھ دیا اور ایک طالب علم کو فرمایا کہ ان کو چھیل کر کھلاؤ اور دوسرے طالب علم کو جیب مبارک سے ایک روپیہ نکال کر دیا اور فرمایا کہ بکری کا عمدہ گوشت بازار سے لاؤ، پھر گھر کے اندر تشریف لے گئے۔

مولوی محفوظ علی صاحب فرماتے تھے کہ گھر میں حضرت فرما رہے تھے کہ بہت معزز مہمان آئے ہیں۔ کھانا عمدہ پکائیو، پھر باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ وہ تو کرے بھر خانیوں کے لے آئے۔ اتنی تکلیف کیوں اُٹھائی، اگر کوئی شے لانا ہی ہو تو بیری چیز لے آیا کرو، میرے ہاں محبت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، بہت تھوڑی چیز لانا چاہئے۔

فصل الخطاب :

پھر فصل الخطاب کے متعلق میں نے تذکرہ شروع کر دیا کہ ایک صاحب نے اس کا جواب لکھا ہے۔ بڑی ہی تعلّی دکھائی ہے۔ فرمایا جب عناد پر کوئی اُتر آئے تو اس کا کیا علاج ہے۔ عصر کے وقت مولانا مشیت اللہؒ چلے گئے۔ ہم سب نماز کے لئے قریب والی مسجد میں چلے گئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے خود امامت کرائی۔ اسی طرح سب نمازوں میں خود ہی امام بنے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کی اقتداء میں کئی نمازیں نصیب کر دیں۔ دوسرے دن نماز فجر میں ہمیں بلایا، اور بڑی شفقت فرمائی۔ میں نے بعض عبارت فصل الخطاب کا مطلب پوچھا۔ نہایت خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے جواب عنایت فرماتے رہے۔ اس پر بڑے خوش ہوئے کہ اس کو کتاب پر نظر ہے۔ پھر فرمایا آپ ذرا لیٹ جایئے۔ یہ کمبل ہیں ان کو نیچے بچھا لیجئے۔ خود اپنے دست مبارک سے عنایت فرمائے۔ ہم نے متبرک سمجھ کر تکیے

نیچے رکھ لئے، پھر دوپہر کو کھانا پر تکلف بھیجا۔ مولانا محفوظ علی اور مولانا محمد ادریس سیکروڑوی اور کئی ایک مہمانوں نے مل کر کھانا کھایا۔

بیعت وتعویذ :

پھر بعد ظہر میں نے عرض کیا کہ ساتھی کو بیعت فرمالیں، نہایت شفقت سے قبول فرمالیا۔ اور دوازدہ تسبیح چشتیہ کا ذکر تلقین فرمایا، پھر احقر نے دو تعویذوں کے لئے عرض کیا کہ نظر کا تعویذ ایک میرے بچے کے لئے اور ان کے بچے کے لئے درکار ہے۔ فرمایا میری تو دوات تعویذ کے قابل نہیں رہی۔ خشک سیاہی پانی ڈالنے سے پھیکی ہو جائے گی اور پرانی دوات اس سے تعویذ نہیں لکھنا چاہئے۔ عرض کیا کہ تعویذ تو حضرت سے لکھوانا ہے پھر دوات میں سیاہی نئی ڈلوائی اور تعویذات لکھ کر ہمارے حوالے کئے، فرماتے تھے خود ہی لکھ لینا۔

"اعوذ بکلمات اللہ التامات من کل شیطان و ھامۃ و کل عین لامۃ"۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ اس پر یہ الفاظ بھی زیادہ کرلے۔ "حصنتک بحصن الف الف"۔

کمال شفقت پر بھی عذر :

احقر نے عرض کیا کہ حضرت ہی تحریر فرمادیں، پھر بڑی عنایت ہوئی۔ جب شام کی گاڑی سے ہم واپس ہونے لگے تو فرمانے لگے، اگر کوئی اور گنجائش ہو تو اور ٹھہر جاؤ۔ احقر نے عرض کیا کہ کل کو رخصت لے لیں گے، پھر اگلے دن صبح کو مجلس ہوئی۔ جب رخصت ہونے لگے تو فرمایا کہ آپ کی مہمانی کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ کچھ خیال نہ کرنا، میں بھی علیل ہوں، مجھے بہت رقت ہوئی کہ اتنی شفقت پر بھی یہ عذر۔

(انوار انوری ص ۵۳)

ایک بیرسٹر کی دلجوئی :

شاہ صاحبؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حسن اخلاق کی خوبی سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ کے پاکیزہ اخلاق و عادات کی وجہ سے ہر کوئی آپ کو عزیز رکھتا تھا۔ چھوٹا ہو یا بڑا ہر ایک کا خیال رکھتے تھے۔ کیا مجال جو کبھی کسی کو آپ کی باتوں سے ٹھیس لگی ہو۔ دوسروں کے جذبات کی قدر کرنا آپ کو خوب آتا تھا۔ چنانچہ آپ اس خوبی سے بات کرتے کہ مقصد بھی حل ہو جاتا اور سننے والے کو آپ کی بات گراں بھی معلوم نہ ہوتی۔

چنانچہ ایک دفعہ شاہ صاحبؒ امرتسر تشریف لے گئے۔ شاہ صاحبؒ کی شہرت سن کر بہت سے لوگ آپ کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوئے۔ اُن میں ایک مشہور و معروف بیرسٹر بھی تھے۔ بیرسٹر صاحب داڑھی مونچھیں نہ رکھتے تھے۔ اس لئے شاہ صاحبؒ کے سامنے بیٹھنے سے کتراتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے بیرسٹر صاحب کی حالت کو بھانپ لیا اور فرمانے لگے بیرسٹر صاحب! آپ تو بلاوجہ شرمندہ ہو رہے ہیں، اگرچہ ہمارا فعل مختلف ہے لیکن ہم دونوں کا مقصد منتہیٰ دنیا داری ہی کرنا ہے، اگر میری داڑھی نہ ہو تو مجھے کوئی بھی روٹی نہ دے اور اگر آپ داڑھی رکھیں تو آپ کو بیرسٹر کون مانے۔ اس لئے آپ کو شرمندہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔

شدید بارش کے باوصف دعوت کے لئے چل پڑے :

ایک مرتبہ ایک صاحب کے یہاں شاہ صاحبؒ کی دعوت تھی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ دعوت کے وقت بارش ہونے لگی، شاہ صاحبؒ نے ایک صاحب سے فرمایا، مولوی محمد حسن صاحب! فلاں صاحب نے آج ہماری دعوت کی ہے، اُن کے گھر چلنا ہے۔ محمد حسن صاحب نے فرمایا، شاہ صاحب! اس وقت تو بارش ہو رہی ہے، کھانا یہیں پر منگوا لیجئے۔

شاہ صاحب نے فرمایا بھائی محمد حسن صاحب! ایسا نہیں ہو سکتا، میرے ایک مخلص نے دعوت کی ہے، ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں وہاں جانے سے رُک جاؤں۔ چنانچہ شاہ صاحب بارش ہی میں نکل پڑے۔ راستہ میں میزبان صاحب سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے لاکھ کہا کہ شاہ صاحب! کھانا دردولت پر پہنچا دیا جائے گا لیکن شاہ صاحبؒ نہ مانے اور بارش ہی میں ان کے گھر جا کر کھانا تناول فرمایا۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحبؒ لوگوں کے جذبات کی کتنی قدر کرتے تھے۔ بعض اوقات آپ کو تکلیف بھی اُٹھانا پڑتی لیکن اس ڈر سے کہ کہیں آپ کی وجہ سے دوسرے کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ اپنی تکلیف کا مطلق ذکر نہ فرماتے اور خندہ پیشانی سے ہر تکلیف کو برداشت کرتے۔ (سیرت انور ص ۲۶)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب : ٨

سلوک وتصوف اور صفائے باطن کا اہتمام' احترامِ اساتذہ واطاعت' حضرت گنگوہیؒ سے عشق ومحبت' عبدیت وانابت' معاصی سے اجتناب اور نفرت

تصوف تربیت اخلاق اور تزکیہ نفوس دین متین کا اہم ترین شعبہ ہے۔ ہمیشہ سے علماء حق کا یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد کسی شیخ سے بیعت کا سلسلہ قائم کر لیتے اور درس و تدریس کے ساتھ ریاضت و مجاہدہ' سند حدیث کے ساتھ سند خلافت باطنی اور جوش احوال کے ساتھ ادب قال کے زمرے میں بھی داخل ہو جاتے۔ یہ علماء حق اہل علم ہونے کے ساتھ ساتھ اہل تصوف بھی ہوتے۔ مدرسہ میں پڑھاتے یا بازاروں سے گزرتے۔ خواص میں بیٹھتے یا عوام سے ملتے اپنی زندگی کے روشن نقوش سے لوگوں کی زندگی اور ان کے فکر و نظر کے زاویوں کا رُخ بدل دیتے۔ ہمارے اسلاف اور اکابر دنیاوی مشاغل کے ساتھ ساتھ ذکر و شغل، تزکیہ باطن، معرفت و سلوک اور مراقبہ و نسبت مع اللہ کے بلند درجات پر فائز ہوتے تھے

میرے غم کی قدر و قیمت کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ چراغ وہ ہے جس سے میرے گھر میں ہے اُجالا

ہمارے اکابرؒ کو عبادت' ذکر الٰہی' تہجد اور وظائف کا بے حد ذوق تھا۔ دن قال اللہ و قال الرسول میں گذرتا تو رات قیام و سجود میں گذر جاتی اور وہ بزبان حال فرماتے۔

دل میں اس طرح ہوا ہے میرے پنہاں کوئی
ہر ادا سے میری ہوتا ہے نمایاں کوئی

تصوف کا اصل مقصد اوراد و اشغال نہیں بلکہ اعمال باطنہ کی اصلاح ہے اور اعمال باطنہ کی اصلاح کے لئے شیخ و مربی اور مرشد کی صحبت از بس ضروری ہے۔

حضرت گنگوہیؒ سے بیعت وخلافت :

محدث کبیر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے جب دارالعلوم سے سند فراغت حاصل کی تو روحانی تربیت اور تزکیۂ باطن کے لئے حضرت مولانا مفتی رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں گنگوہ حاضر ہوئے۔ بچپن ہی سے حضرت شاہ صاحب وظائف کا اہتمام کرتے تھے۔ خصوصاً اپنے والد حضرت مولانا پیر معظم شاہ صاحب کو جن اذکار و اوراد میں مشغول پاتے، خود بھی وہی وظائف شروع کر دیتے۔ لیکن جب حضرت گنگوہیؒ کے دست حق پر بیعت ہوئے تو ہمیشہ اُن کے تلقین فرمودہ ذکر و وظائف پر کاربند رہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب جو حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذ خاص تھے فرماتے ہیں :

حضرت شاہ صاحبؒ کے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ارشاد و تلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ بیعت بھی فرمالیتے تھے۔ اپنے اکابر سے سُنا کہ حضرت گنگوہیؒ کی طرف سے مجاز بیعت بھی تھے۔ دیوبند کے بعض لوگ بھی آپ سے بیعت تھے۔ الہ دین دیوبندی جو حضرت نانوتویؒ کے دیکھنے والوں میں تھے، حضرت شاہ صاحب سے بیعت تھے۔ حضرت شیخ الہند کے وصال کے بعد میں نے اور جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان مقیم کراچی نے بھی حضرت شاہ صاحب کی طرف رجوع کیا۔ آپ نے ہمیں طریق چشتیہ کے مطابق اذکار تلقین فرمائے اور ہم اس میں کھلی تاثیر وتصرف محسوس کرتے تھے۔

(حیات انور ص ۲۰۲)

باطنی کیفیت کی جھلک :

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی اپنے استاد مکرم حضرت امام کشمیریؒ کی باطنی

کیفیت اور تصوف سے متعلق علوم ومعارف کو ان الفاظ میں بیان کیا۔ فاضل گیلانی لکھتے ہیں :

حادث یعنی کائنات و مخلوقات کا قدیم یعنی خالق سے کیا تعلق ہے۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں ربط الحادث بالقدیم یہی عنوان قائم کر کے اس سلسلے میں کچھ فرماتے تھے۔ یہی تصوف کے نظری حصہ کا بنیادی و اساسی مسئلہ تھا۔ پہلی دفعہ شاہ صاحب نے اس مغالطہ کا ازالہ فرمایا کہ عوام الناس خالق ومخلوق کے تعلقات کو صانع و مصنوع یا معمار و مکان کی مثال سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ مصنوع اپنے باقی رہنے میں چونکہ صانع کا محتاج نہیں ہوتا یعنی مکان کو بن جانے کے بعد معمار کی ضرورت باقی نہیں رہتی، عوام کی سمجھ میں صحیح طور پر اس لئے نہیں آتا کہ پیدائش میں تو عالم خدا کا محتاج ہے لیکن پیدا ہو جانے کے بعد عالم کو اپنی بقا میں خدا کی کیا ضرورت ہے؟ صوفیہ اس وسوسہ کا ازالہ اپنے اس نظریہ سے کرتے ہیں جو وحدت الوجود وغیرہ ناموں سے مشہور ہے اور نہ جاننے والوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ صوفیہ وحدت الوجود کے جو قائل ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ان کا ایمان وحدت الوجود پر ہے یعنی سارے موجودات ایک ہیں، حالانکہ الوجود کی وحدت کو الموجود کی وحدت سے کیا تعلق؟

مسئلہ احسان :

اسی طرح مشہور حدیث جبرئیل جس میں ہے کہ ایمان و اسلام اور احسان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسافر کے بھیس میں حضرت جبرئیل نے سوالات کئے تھے۔ اس حدیث میں ''الاحسان'' کے لفظ کا ترجمہ ہی شاہ صاحبؒ نے ایسا کیا کہ تصوف کے عملی حصہ کی اصل خصوصیت سامنے آگئی۔ فرمایا تھا کہ احسان کا صلہ جب الیٰ کے ساتھ آتا ہے تو کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا اس کا مطلب ہوتا ہے لیکن صلہ کے بغیر صرف

احسان کا ترجمہ ''حسن پیدا کرون'' کرنا چاہئے۔ یہی یا قریب قریب اسی کے فارسی زبان
میں احسان کا ترجمہ کر کے فرمایا کرتے تھے کہ عقائد واعمال اور زندگی کے تمام شعبوں میں،
جو مذہب کے دائرے میں داخل ہیں، ان کو بار ٹھہراتے ہوئے سر سے ٹالنا، ایک حال تو یہ
ہوتا ہے، لیکن ان میں حسن آفرینی کی کوشش بس یہی احسان ہے اور تصوف کا مطلب یہی
ہے کہ بجائے تکلیف کے دین ہی گویا زندگی کا اقتضاء بن جائے' اور یوں دین کے ہر شعبہ
میں حسن کے اندر حسن کا اور جمال کے اندر جمال کا اضافہ کرتے چلے جانا چاہئے۔ یہی
الاحسان کے مقام کا اقتضا ہے۔ خیال آتا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں ''المحسنین'' کا
لفظ آیا ہے، اس کا صحیح مصداق شاہ صاحب کے نزدیک مسلمانوں کا وہی طبقہ ہے جو دینی
مطالبات کی تعمیل میں اپنے پیش نظر احسانی نقطۂ نگاہ رکھتا ہے۔

(احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے چند دن ص ۹۲)

علم غالب اور سلوک مغلوب تھا:

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اپنے مشاہدات لکھتے ہوئے فرماتے ہیں،
علمی شغف وانہماک اور علمی کمال کا آپ پر اتنا غلبہ تھا کہ دوسرے تمام کمالات اور زندگی کے
دوسرے پہلو اس کے نیچے بالکل دبے ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ کی زندگی کا وہ بلند ترین پہلو
جس کو ''سلوک وتصوف'' سے تعبیر کرنا چاہئے۔ اس علمی کمال اور شغف علمی سے دبا ہوا تھا۔
اسی وجہ سے بہت سے لوگ آپ کی زندگی کے اس رخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہ عاجز
بھی کچھ زیادہ واقف نہیں ہے لیکن اجمالاً اتنا ضرور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس
دولت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا اور یقیناً آپ آراستہ باطن اصحاب احسان میں سے
تھے۔ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ سے مجاز بھی تھے، لیکن اس لائن کی باتیں کرنے کی عادت

نہ تھی۔

احسانی کیفیت شریعت وسنت پر استقامت ہے:

البتہ ایک دفعہ ایک واقعہ سنایا اور اس سلسلہ میں جو کچھ جوش آ گیا تو ایک آدھ
بات ہم لوگوں کو ایسی بھی سننی میسر آ گئی جس سے کچھ سمجھا جا سکا کہ اس فضا میں بھی حضرت
استاذ کی پرواز کتنی بلند ہے۔ جو واقعہ حضرت نے سنایا وہ یہ تھا:

فرمایا کہ ایک دفعہ میں کشمیر سے یہاں کے لئے چلا۔ راستہ کی کافی مسافت
گھوڑے پر سوار ہو کر طے کرنی پڑتی تھی۔ راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا۔ یہ پنجاب
کے ایک مشہور پیر صاحب کے مرید تھے اور ان ہی کے پاس جا رہے تھے۔ یہ مجھ سے اپنے
ان پیر صاحب کا اور ان کے کمالات اور کرامات کا تذکرہ راستہ بھر کرتے رہے۔ ان کی
خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی ان پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں اور اتفاق سے
وہ مقام میرے راستہ میں بھی پڑتا تھا۔ میں نے بھی ارادہ کر لیا۔ جب ہم دونوں پیر صاحب
کی خانقاہ پر پہنچے تو ان صاحب نے مجھ سے کہا کہ نئے آدمیوں کو اندر حاضر ہونے کے لئے
اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے میں پہلے جا کر آپ کے لئے اجازت لے لوں۔
چنانچہ وہ اندر تشریف لے گئے، ان بزرگ نے اطلاع پا کر خود اپنے صاحبزادے کو مجھے
لینے کے لئے بھیجا اور اکرام سے پیش آئے۔ خود ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے، باقی سب
مریدین وطالبین نیچے فرش پر تھے، مگر مجھے اصرار سے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ کچھ باتیں
ہوئیں، اس کے بعد اپنے مریدین کی طرف متوجہ ہو گئے اور اپنے طریقہ پر ان پر توجہ ڈالنی
شروع کی اور اس کے اثر سے وہ بے ہوش ہو ہو کر لوٹنے اور تڑپنے لگے۔ میں یہ سب دیکھتا
رہا، پھر میں نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر آپ

توجہ فرمائیں۔ انہوں نے توجہ دینی شروع کی اور میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پاک کا مراقبہ کرکے بیٹھ گیا۔ بیچاروں نے بہت زور لگایا اور بہت محنت کی، لیکن مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے خود ہی فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں پڑسکتا۔

حضرت استاذ نے یہ واقعہ اتنا ہی نقل فرمایا اور اس کے بعد ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا:

''کچھ نہیں ہے لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے ایک کرشمہ ہے اور کچھ مشکل بھی نہیں معمولی مشق سے ہر ایک کو حاصل ہوسکتا ہے۔ ان باتوں کا خدارسیدگی سے کوئی تعلق نہیں''۔

پھر اسی سلسلہ میں اور اسی جوش کی حالت میں فرمایا:

''اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو ان شاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہوسکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے، لیکن یہ بھی کچھ نہیں۔ اصل چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت وسنت پر استقامت ہے۔ (حیات انور ص ۱۶۷)

حضرتؒ صوفی بھی ہیں:

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ فرماتے ہیں کہ میں جب دہلی پڑھتا تھا تو میں نے سنا کہ مولانا کریم بخش صاحب گلاوٹھی ضلع بلند شہر سے حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کرنے تشریف لائے ہیں۔ میرے چونکہ مولانا کریم بخش صاحب استاد تھے، میں بھی گیا۔ یہ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ مولانا کریم بخش صاحب تو ملے نہیں، حضرت شاہ صاحب کو دیکھا کہ مدرسہ امینیہ کے اندر بیٹھے ہیں اور ذکر جہری سے اللہ اللہ کررہے ہیں۔ تب میں سمجھا کہ حضرت صوفی بھی ہیں۔ یہ تو حضرت شاہ صاحبؒ نے خود فرمایا تھا۔ بہاولپور،

کے مقدمہ میں احقر نے ریل گاڑی میں جب امرتسر سے لاہور کو چلے، سوال کیا کہ آپ کو اجازت کن بزرگوں سے ہے، تو فرمایا حضرت گنگوہیؒ سے ۱۳۱۹ھ میں حضرتؒ نے مجھے حدیث کی سند بھی دی اور بیعت کرنے کی اجازت بھی دی۔ ویسے تو ہمارا سلسلہ دس پشت سے سہروردی ہے اور مجھے حضرت مولانا محمد معظم شاہ والد صاحب سے اجازت ہے۔

(ف) حضرت شاہ صاحب عموماً سہروردی سلسلہ میں اور چشتیہ سلسلہ میں بیعت کرتے تھے۔ دونوں حضرات کے ذکر تلقین کرتے تھے۔

شاہؒ صاحب کو دیکھ کر خدا یاد آجاتا ہے:

حضرت شاہ صاحبؒ ایک دفعہ گنگوہ تشریف لے گئے تو حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا۔ حضرت میرے لئے دعا فرمائیں کہ مجھے نماز پڑھنی آجائے۔ دیوبند کے بزرگوں میں مشہور تھا کہ حضرت شاہ صاحب جب نماز پڑھتے ہیں تو ٹھیک بندہ بن کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ہمارے ایک استاد حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب تھے، وہ فرماتے تھے کہ شاہ صاحب کو دیکھ کر خدا یاد آجاتا ہے۔ یہی اولیاء اللہ کی نشانی ہے۔ کم از کم میں نے ساری زندگی حضرت شاہ صاحب جیسا نماز پڑھنے والا نہیں دیکھا۔ (انوار انوری ص ۱۶،۱۵)

حضرت گنگوہیؒ کے عاشق زار:

مولانا سید احمد رضا مؤلف انوار الباری لکھتے ہیں:

حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام ربانی حضرت گنگوہیؒ نہ صرف مذہب حنفی کے ماہر تھے، بلکہ چاروں مذاہب کے فقیہ تھے، میں نے اُن کے سوا کسی کو نہیں دیکھا جو چاروں مذاہب کا ماہر ہو۔ (مقدمہ انوار الباری ج ۲ ص ۲۳۶)

حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک مرتبہ فرمایا، ہم یہاں کشمیر سے ہندوستان آئے تو

دین حضرت گنگوہیؒ کے پاس دیکھا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے یہاں دیکھا۔ جو دیکھنا چاہے وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے یہاں جا کر دیکھے۔ حضرت گنگوہیؒ کی شان میں شاہ صاحبؒ نے ایک عربی قصیدہ لکھا، جب مصر کے بہت بڑے عالم علامہ رشید رضا دیوبند آئے تو خطبہ استقبالیہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اکابرین دیوبند کے تذکرہ کے ذیل میں حضرت گنگوہیؒ کے علمی و روحانی کمالات کے بارے میں اپنا عربی قصیدہ بھی پڑھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ حضرت گنگوہیؒ کے عاشق زار تو تھے ہی کیونکہ حضرت گنگوہیؒ سے تو ان کو بیعت کا تعلق تھا، آپ نے حضرت گنگوہیؒ کے علاوہ دوسرے اساتذہ کرام کے احترام اور عقیدت میں بھی کبھی کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

امام کشمیریؒ اپنے اُستاذ پر پنکھا چلاتے رہے :

حضرت مولانا محمد انوری لائل پوری کا بیان ہے :

حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم کے صدر مدرس تھے جو اس علمی درسگاہ کا سب سے بڑا عہدہ ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا کی اسارت کے بعد دیوبند واپس ہوئے۔ میں اپنے والد مرحوم کے ہمراہ دارالعلوم میں داخلہ کے لئے دیوبند پہنچا۔ حضرت شاہ صاحب کی زیارت کا اب تک موقع نہیں ملا تھا، لیکن آپ کی علمی عظمت کا احساس آپ کے سینکڑوں تلامذہ سے سن کر دل و دماغ پر غالب تھا۔ دیوبند پہنچ کر میرے والد مجھے لے کر آستانہ شیخ الہندؒ پر پہنچے۔ گرمی کا زمانہ تھا اور ظہر کی نماز ہو چکی تھی۔ حضرت کی مردانہ نشست گاہ میں ایک ہجوم حضرت کو چہار طرف سے گھیرے ہوئے بیٹھا تھا۔ چھت میں لٹکے ہوئے پنکھے کو ایک صاحب کھینچ رہے تھے، جن کا پُر انوار چہرہ اس پر معصومیت و نورانیت شکوہ علم اور جلالت علمی

کی ملی جلی کیفیات دعوت نظارہ دیتیں یہ صاحب پنکھا کھینچتے ہوئے چپکے چپکے لوگوں سے کہتے ذرا ہٹ کر بیٹھیے، کہیں حضرت کو تکلیف نہ ہو۔ والد صاحب نے چپکے سے میرے کان میں کہا کہ یہ پنکھا کرنے والے دارالعلوم کے صدر مدرس حضرت مولانا انور شاہؒ ہیں، یہ سن کر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ جس کی ذات گرامی کی علمی شہرتوں سے ایک عالم گونج رہا ہے اور جس کے خود اپنے شاگرد اس مجلس میں موجود ہیں، کس خدمت اور عقیدت سے اپنے اُستاذ کی خدمت میں مصروف ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا احترام :

مولانا اعزاز علی صاحب فرماتے کہ حضرت شاہ صاحبؒ جب حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے آتے تو احتراما جھک جاتے کہ ہمیں آپ کے گرنے کا اندیشہ ہوتا۔

حکیم صفت احمد صاحب کہتے ہیں، مالٹا سے تشریف لانے کے بعد دوپہر کو معمولا میری حاضری حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں ہوتی۔ حضرت اقدس اس وقت کچھ آرام فرماتے اور میں آپ کا بدن دابتا۔ ایک روز حضرت چادر اوڑھے ہوئے استراحت فرما رہے تھے اور میں حسب دستور بدن دبا رہا تھا کہ اچانک شاہ صاحب تشریف لائے۔ آنے کو تو آ گئے لیکن یہ دیکھ کر کہ حضرت آرام فرما رہے ہیں، بڑی تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ لمحات ایسے گذرے کہ اپنے سانس کو اس طرح روکے رہے جیسا کہ آپ زندہ ہی نہ ہوں، یہ ساری کوشش اس لئے تھی کہ حضرت استاد کو کسی تیسرے کی موجودگی کا احساس ہو کر آرام میں خلل نہ آئے۔ (نقش دوام ص ۱۰۴، ۱۰۵)

سراپا انکسار خادم :

مولانا مشیت اللہ صاحب کے بڑے صاحبزادے حکیم محبوب الرحمٰن صاحب

فاضل دیوبند کا بیان ہے :

میں جب دیوبند پڑھتا تھا تو حضرت شاہ صاحب کے ساتھ آپ کے رہائشی کمرہ میں میرا قیام تھا۔ حضرت کو پان کی عادت تھی۔ ایک روز میں نے پان لگا کر پیش کیا، آپ نے منہ میں رکھا ہی تھا کہ مجھے سامنے سے حضرت شیخ الہندؒ تشریف لاتے ہوئے نظر آئے جو کسی ضرورت سے اپنے شاگرد کے پاس تشریف لا رہے تھے۔ شاہ صاحبؒ کو حضرت کے اس وقت آنے کی اطلاع کی گئی، میں اس اضطراب کو بھول نہیں سکتا جو اس وقت شاہ صاحبؒ پر اپنے استاد کی آمد اور منہ سے پان نکالنے کی عجلت کی صورت میں طاری تھی۔ تیزی کے ساتھ اپنے منہ کو صاف کیا اور کمرے کے دروازے پر ایک سراپا انکسار خادم کی حیثیت سے اپنے آقا کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔ (نقش دوام ص ۹۲)

سارا فتنہ ختم ہو گیا :

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رقمطراز ہیں :

فتنہ ۳۲ھ میں جب معاملہ حدود سے بڑھنے لگا اور حضرت شاہ صاحبؒ نے مدرسہ میں آنا اور درس دینا چھوڑ دیا، جس سے طلبہ میں انتشار پھیل گیا اور اسٹرائک کی صورت پیدا ہوئی تو حضرت والد ماجدؒ نے بلا واسطہ اس مسئلہ کو سلجھانے کی سعی فرمائی اور ایک دن اچانک صبح کے وقت حضرت شاہ صاحب کے مکان پر تن تنہا پہنچ گئے اور اطلاع ہونے پر ایک دم گھبرا کر حضرت شاہ صاحب باہر تشریف لائے اور اسی سابقہ نیازمندی کے ساتھ بہت ہی مؤدبانہ انداز سے پردہ کرا کر گھر میں لے گئے۔ گردن جھکا کر عرض کیا کہ حضرت اس وقت اچانک کیسے تکلیف فرمائی؟

حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ حضرت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میرا ابھی آپ پر کوئی حق ہے؟ فرمایا ہے، اور یہ ہے کہ اگر آپ میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہنیں تو مجھے کوئی عذر

نہ ہو گا۔ والد ماجد نے فرمایا کہ بارک اللہ۔ بس تو میری گذارش یہ ہے کہ آپ ان قصوں کو چھوڑ دیں اور مدرسہ چلیں اور میرے ساتھ چلیں۔ فرمایا بہت اچھا۔ حضرت نے چند مطالبات پیش فرمائے کہ حضرت انہیں یوں کر دیا جائے۔

والد ماجد نے فرمایا کہ آپ کا منصب مطالبہ کرنے کا نہیں مطالبے پورا کرنے کا ہے۔ آپ اپنے قلم سے جو مناسب سمجھیں چل کر خود کر دیں۔ اس پر ساتھ ہو لئے اور مدرسہ میں پہنچ گئے۔ سب کو حیرت اور بے انتہا مسرت ہوئی کہ سارا فتنہ ختم ہو گیا۔ والد ماجد نے فرمایا کہ یہ سب مطالبے آپ خود جاری کر دیں اور درس شروع کرا دیں۔ فرمایا کہ حضرت اتنی اجازت دیں کہ ظہر کے بعد حاضر ہو کر درس شروع کروں۔ فرمایا مضائقہ نہیں۔

(حیات انور ص ۲۳۲)

استاذ کے یکہ کے پیچھے دوڑتے رہے :

حضرت شاہ صاحبؒ تمام اساتذہ کا احترام کرتے تھے۔ مولانا منفعت علی صاحب دیوبندی جو دارالعلوم کے استاد تھے۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے دہلی گئے، حضرت شاہ صاحب اس وقت مدرسہ امینیہ کے صدر مدرس تھے۔ مولانا منفعت علی صاحب حضرت شاہ صاحب کے ہاں ٹھہرے، جب مولانا منفعت علی صاحب دیوبند واپس ہونے لگے تو شاہ صاحب کے پاس سواری کے لئے پیسے نہیں تھے۔ اپنے استاد کو یکہ پر سوار کر دیا اور خود شاہ صاحب پیچھے دوڑتے گئے۔

کتاب کا احترام :

اساتذہ کے احترام کے ساتھ کتاب کا بھی احترام کرتے۔ قاری محمد طیب صاحب لکھتے ہیں :

حضرت شاہ صاحب خود فرمایا کرتے کہ میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع نہیں کرتا

بلکہ خود ہمیشہ کتاب کا تابع ہو کر مطالعہ کرتا ہوں۔ چنانچہ سفر و حضر میں ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر مطالعہ کر رہے ہوں یا کتب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مؤدب انداز سے بیٹھتے۔ گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ کر رہے ہیں۔

مطالعہ کے لئے وضو کا اہتمام :

یہ بھی فرمایا کہ "میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضو نہیں کیا"۔ سبحان اللہ کہنے کو تو یہ بات بہت چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن اس پر استقامت اور دوام ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہی کر سکتا ہے جسے حق تعالیٰ نے ایسے کاموں کے لئے موفق اور میسر کر دیا ہے اور وہ گویا بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ اس سے دینی آداب کے عملی نمونے پیش کرائے جائیں۔ کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ

ہر کسے را بہر کارے ساختند　　میل او را در دلش انداختند

کسی غیر محرم عورت پر نظر نہ پڑ جائے :

حضرت شاہ صاحبؒ کے تصوف کا تذکرہ کرتے کرتے ہم بہت دور نکل آئے تصوف و سلوک کا ثمرہ بھی تو یہی ہے کہ انسان میں اساتذہ کا احترام، کتابوں کا احترام، طلباء پر شفقت، تقویٰ و پرہیزگاری، تواضع و عبدیت کے آثار ظاہر ہوں اور اخلاقِ رذیلہ مثلاً غیبت، بدگوئی، چغلی، بدنظری سے انسان محفوظ ہو جائے۔ حضرت شاہ صاحب بھی تمام اخلاقِ رذیلہ سے محفوظ تھے۔

مشہور عارف باللہ حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری جنہوں نے دلی کے قیام کے زمانہ میں آپ سے میبذی، ملا حسن اور ترمذی پڑھیں۔ فرماتے ہیں۔ حضرت

صاحب مہینوں مسجد سے باہر نہ نکلتے تھے اور کبھی ضرورت کے لئے باہر نکلنا ہوتا تو چہرہ پر رومال اس طرح ڈال لیتے کہ سوائے راستہ کے گرد و پیش کے کوئی چیز نظر نہ آتی، یہ اہتمام اس لئے تھا کہ کسی غیر محرم عورت پر نظر نہ پڑ جائے۔ (نقش دوام ص ۸۷)

جب پہلی مرتبہ اتفاقاً غیر محرم خاتون پر نظر پڑی :

حضرت مولانا انظر شاہ فرماتے ہیں۔ میں نے اپنی والدہ سے سنا ہے کہ شادی کے بعد حضرت والد کا قیام دار العلوم کے ایک کمرہ میں تھا اور والدہ مولانا محمد طیب صاحب کی رہائشی مکان سے متصل ایک مکان میں جو مہتمم صاحب کی ملکیت تھا، قیام فرما تھیں۔ شاہ صاحبؒ مکان پر تشریف لاتے تو دستور یہ تھا کہ دستک دیتے اور اجازت کے بعد اندر تشریف لاتے۔ اتفاقاً ایک روز مہتمم صاحب کی والدہ ہمارے گھر میں تشریف رکھتی تھیں۔ حضرت شاہ صاحب تشریف لائے اور زنان خانے میں آنے کی اجازت چاہی۔ والدہ کو سہو ہوا اور اجنبیہ کا خیال دل سے نکل گیا۔ اندر آنے کی اجازت دی۔ شاہ صاحبؒ نے جونہی زنان خانے میں قدم رکھا تو ان اجنبیہ پر نظر پڑنے کے ساتھ ہی استغفار پڑھتے ہوئے اُلٹے پاؤں باہر لوٹ گئے۔

اس اتفاقی حادثہ کی تکلیف جو کچھ آپ کو ہوئی، وہ ایک مدت کے لئے والدہ مرحومہ سے ناراضگی کی شکل اختیار کر گئی۔ اپنے سبق میں طلباء کے سامنے غمگین لہجے میں فرمایا: بھائی! بالغ ہونے کے بعد کل بلا ارادہ مولانا طیب صاحب کی والدہ پر نظر پڑ گئی، جس کی تکلیف سوہان روح کی طرح محسوس کرتا ہوں۔

حرام کسب کا پان بھی گوارا نہ ہو سکا :

حضرت شاہ صاحبؒ کے نامور شاگرد مولانا بدر عالم میرٹھی کا بیان ہے :

ایک بار آپ دیوبند سے سفر فرما رہے تھے اور رفیق سفر کی حیثیت سے میں آپ کے ساتھ تھا۔ ریل کے جس ڈبہ میں سوار ہوئے اس میں دو خوش پوشاک، خوش رو عورتیں بھی تھیں۔ حضرت شاہ صاحب جب گاڑی میں تشریف رکھتے تو اپنے منور چہرہ کی وجہ سے مرکز نگاہ بن جاتے۔ یہ عورتیں برابر آپ کو دیکھتی رہیں اور آپ حسب دستور کتاب کے مطالعہ میں مستغرق رہے۔ دونوں عورتوں کے ساتھ ایک بڑا پان دان تھا، انہوں نے پان لگایا اور طشتری میں رکھ کر مجھے دیا کہ ان بزرگوں کیلئے پیش کردوں۔ دونوں کا اصرار اتنا زیادہ تھا کہ ان سے پان لینے اور شاہ صاحب کو پیش کرنے کے سوا میرے لئے کوئی چارہ کار نہیں رہا، میں نے طشتری آپ کے سامنے رکھ دی، استغراق مطالعہ میں آپ نے بھی بے تکلف پان منہ میں رکھ لیا ابھی چند منٹ بھی نہ گذرے تھے کہ آپ پر امتلاء کی کیفیت طاری ہوگئی اور مسلسل قے شروع ہوگئی۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ غالباً تمباکو مقدار سے بڑھ گیا، جس سے امتلاء کی شدت ہے۔ دوسرا پان کھول کر دیکھا تو تمباکو کی مقدار آپ کی معمولاً مقدار سے بھی کم تھی، پھر شبہ ہوا کہ کوئی قے آور چیز تو پان میں نہیں دی گئی، لیکن موجود دوسرے پان کو خوب دیکھنے کے بعد یہ بدگمانی بھی جاتی رہی۔ میرٹھ کے اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ دونوں عورتوں کا تعلق طوائفوں سے تھا۔ اب معلوم ہوا کہ اس پاکیزہ باطن انسان کا دل حرام کسب کے پان کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اللہ اکبر مردان خدا کے ساتھ خدائے حفیظ و حافظ کا یہ حفاظتی معاملہ۔ (نقش دوام ص ۸۰)

مزاج کی یہ لطافت، باطن کی پاکیزگی، اللہ کی طرف سے حفاظت اور سلامتی فکر کے باوجود پیری مریدی اور سلوک وتصوف بطور مستقل شغل کے شاہ صاحبؒ کے یہاں نہیں تھی۔ اگر کوئی شخص تعویذ مانگتا تو حتی الوسع اجتناب کرتے۔ اعمال واشغال میں آپ کسی خاص طریقہ سلوک کے پابند نہ تھے۔

حفاظتِ مال کا تعویذ :

ایک دفعہ فرمایا :

حافظ ابو زرعہ رازی نے فرمایا کہ جرجان میں آگ لگنے سے ہزار ہا گھر جل گئے، اور قرآن بھی جلے۔ لیکن یہ آیات نہ جلیں ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ. (یٰس ۳۸) و عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ. (ابراہیم ۱۱) وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُونَ. (ابراہیم ۴۲) وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا. (النحل ۱۸) وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ. (بنی اسرائیل ۲۳) تَنْزِيلًا مِمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى. (طٰہٰ ۴) لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى. (طٰہٰ ۶) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۝ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ. (الشعراء ۸۸،۸۹) وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ. (حم السجدہ ۱۱) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. (الذاریات ۵۶) مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ. (الذاریات ۵۷) إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ. (الذاریات ۵۸) و فِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ. (الذاریات ۲۲) فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ۔ (الذاریات ۲۳)

فرمایا یہ تجربہ ہے کہ آیات مذکورہ لکھ کر کسی برتن میں بند کر کے دوکان یا سامان میں رکھنا حفاظت کے لئے مجرب ہے۔

فرمایا کہ ایک آدمی یا کئی آدمی مل کر ہر سورت کی آخری آیت پڑھ کر پانی پر دم کریں تو اعلاج مرض کے لئے مفید ہے۔

کیڑے سے حفاظت کا تعویذ :

فرمایا: اگر کوئی درج ذیل اسماء کو کاغذ پر لکھ کر چھت سے تعویذ باندھ دے تو چھت کی لکڑی کو کیڑا نہیں لگتا۔

فقہاءِ سبعہ مدینہ :

فرمایا: فقہائے سبعہ مدینہ ان کے نام مبارک یہ ہیں ـــــــ

الا کل من لا یقتدی بائمة ! فقسمته ضیزی عن الحق خارجه
فخذهم عبید الله و عروة وقاسم سعید وابوبکر سلیمان و خارجه

(انوار انوری ص ۸۲)

حضرت شاہ صاحبؒ کے چھوٹے بھائی جناب حضرت مولانا سید سلیمان شاہ صاحبؒ راوی ہیں کہ ایک کشمیری جو کہ باولا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کا ایک جگہ کشمیر میں وعظ ہو رہا تھا، وہ گڑبڑ کرتا ہوا دوڑ کر حضرت کی طرف آیا۔ حضرت شاہ صاحب نے ایک تھپڑ مارا، اس کی حالت درست ہوگئی۔ فوراً صحت یاب ہوگیا۔ اس کے بعد کبھی بھی دیوانوں والی حرکت نہیں کی۔ (انوار انوری ص ۳)

حضرت شاہ صاحبؒ کا قلب وقالب اور ظاہر و باطن تصوف کے نور سے منور تھا۔ آپ کے قلب مبارک میں معرفت ومحبت الٰہیہ کا بحر موجزن تھا۔ ایک ایک لفظ سے معرفت کے سوتے اُبلتے تھے۔ غفلت کا غبار دھلتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور مردہ دلوں میں محبت الٰہی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ آپ باطنی حالات ومکاشفات میں بڑے بلند رتبہ کے حامل تھے ـــــــ

کتنے نغمے ہیں کہ پردوں میں چھپا رکھے ہیں
آپ چھیڑیں تو یہ ساز دل ناساز کبھی

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب : ۹

عشقِ رسول ﷺ
اور
قادیانیت کا تعاقب

ہر وہ شخص جس کو اللہ نے ایمان اور عقل و فہم کی دولت نصیب فرمائی ہے، وہ یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ عشق رسول ﷺ ایمان کی روح اور بنیاد ہے ــــــ

محمد کی محبت دینِ حق کی شرطِ اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

ربّ ذوالجلال نے ہر مسلمان پر محمد عربی ﷺ کی محبت اس کے تمام خویش و اقارب، اعزہ و احباب سے زیادہ لازم کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: میرے حبیب! فرما دیجئے اے لوگو! تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہاری عورتیں، تمہارا کنبہ، تمہاری کمائی کے مال، تمہاری تجارت، جس کے نقصان کا تمہیں ڈر رہتا ہے اور تمہاری پسند کے مکان ان میں سے کوئی چیز بھی اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے تو انتظار کرو کہ اللہ اپنا عذاب اُتارے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (توبہ)

انس بن مالک انصاریؓ فرماتے ہیں کہ محمد عربی ﷺ نے فرمایا:

تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے ماں باپ، اولاد اور سب آدمیوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس مضمون کی متعدد آیات و احادیث موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان و نجات کا دار و مدار محمد رسول اللہ ﷺ کی محبت پر ہے۔ محبت ایسی چیز ہے جو ظاہر میں بھی نظر آتی ہے اور دل میں بھی موجزن رہتی ہے ــــــ

نگاہوں سے ٹپکتی ہے اداؤں سے برستی ہے
محبت کون کہتا ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

ذکرِ محبوب ﷺ :

نبی ﷺ کی محبت کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ محبِ مخلص اور نبی ﷺ کا عاشقِ زار اکثر محبوبِ دوعالم ﷺ کا تذکرہ کر کے اپنے دل میں عشق کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا سامان کرتا ہے۔ حدیث میں ہے، جس کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے، وہ اکثر اس کا ذکر کرتا ہے۔

روضۂ رسول ﷺ پر حاضری :

محدث کبیر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری صاحبؒ بھی رسول اللہ ﷺ کے عاشق اور سچے محب تھے۔ جب یکم محرم الحرام ۱۳۳۴ھ کو آپ روضۂ رسول پر عرضِ سلام کے لئے حاضر ہوئے تو نہایت رقت آمیز انداز میں بارگاہِ محمدی میں درج ذیل اشعار کا نذرانہ پیش کیا ——

اے صبا عالم رساں تز ور سول
گرچہ از تر دامنی خستم ولے
چوں گدا ہستم ندارم از درم
چوں رسیدی انور ابر کوئے او

اذ مالی نحو مولی قد باؤل
علی ان اروی اذا ھبت قبول
انہ لا یبھر الوجہ سؤل
انک الآتی بخیر فی القفول

سوزِ درون و عشقِ رسول ﷺ :

محدث کبیر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی علمی زندگی سراپا معمورۂ عشقِ رسول تھی۔ عشقِ رسول ان کی زندگی کی سب سے قیمتی متاعِ عزیز تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب

قادیانیت نے اپنے پر پُرزے نکالنے شروع کیے تو حضرت شاہ صاحب کے دن کا چین اور رات کی نیند اڑ گئی، کیونکہ سوزِ درون عشقِ رسول ﷺ کے راستے کی خشتِ اول ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت شاہ صاحبؒ سے شرفِ تلمذ رکھتے ہیں، وہ اپنا واقعہ اپنے قلم سے لکھتے ہوئے فرماتے ہیں :

قادیانیت کا ارتداد اور کفر کا سیلاب اُمڈتا چلا آرہا ہے :

میں حسبِ عادت ایک روز استاذِ محترم حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی دائمی عادت کے خلاف یہ دیکھا کہ ان کے سامنے کوئی کتاب زیرِ مطالعہ نہیں، خالی بیٹھے ہوئے ہیں اور چہرے پر فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کیسا مزاج ہے؟ فرمایا کہ بھائی مزاج کو کیا پوچھتے ہو، قادیانیت کا ارتداد اور کفر کا سیلاب اُمڈتا چلا آتا ہے۔ صرف ہندوستان میں نہیں عراق و بغداد میں ان کا فتنہ سخت ہوتا جاتا ہے اور ہمارے علماء و عوام کو اس طرف توجہ نہیں۔ ہم نے اس کے مقابلہ کے لئے جمعیۃ علماء ہند میں یہ تجویز پاس کرائی تھی کہ دس رسالے مختلف موضوعات متعلقہ قادیانیت پر عربی زبان میں لکھے جائیں اور ان کو طبع کرا کر بلادِ اسلامیہ میں بھیجا جائے، مگر اب کوئی کام کرنے والا نہیں ملتا اس کام کی اہمیت لوگوں کے خیال میں نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اپنی استعداد پر تو بھروسہ نہیں لیکن حکم ہو تو کچھ لکھ کر پیش کروں۔ ملاحظہ کے بعد کچھ مفید معلوم ہو تو شائع کیا جائے، ورنہ بے کار ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

ھدیۃ المھدیین کی طباعت :

ارشاد ہوا کہ مسئلہ ختمِ نبوت پر لکھو۔ احقر نے استاذِ محترم کی تعمیلِ ارشاد کو سرمایۂ سعادت سمجھ کر چند روز میں تقریباً ایک سو صفحات کا ایک رسالہ عربی زبان میں لکھ کر آپ کی

خدمت میں پیش کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ رسالہ دیکھتے جاتے تھے اور بار بار دعائیہ کلمات
زبان پر تھے۔ مجھے کوئی تصور نہ تھا کہ اس ناچیز خدمت کی اتنی قدر افزائی کی جائے گی، پھر
خود ہی حضرت نے اس رسالہ کا نام "ھدیۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النبیین" تجویز
فرما کر اس کے آخر میں ایک صفحہ بطور تقریظ تحریر فرمایا اور اپنے اہتمام سے اس کو طبع کرایا۔
مصر، شام، عراق مختلف مقامات پر اس کے نسخے روانہ کئے۔

قادیان میں اعلانِ حق اور ردِ مرزائیت :

اسی زمانہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ایماء پر امرتسر و پٹیالہ و لدھیانہ کے چند علماء
نے یہ تجویز کیا کہ اس فتنہ کے استیصال کے لئے خاص قادیان میں ایک تبلیغی جلسہ سالانہ
منعقد کیا جائے تاکہ "قضیہ زمین برسرِ زمین" طے ہو سکے۔ یہ عوام کو فریب میں ڈالنے
والے مناظرے اور مباہلے کے چیلنج جو اکثر اس فرقہ کی طرف سے چھپتے رہتے ہیں، ان کی
حقیقت لوگوں پر واضح ہو جائے۔ چنانچہ چند سال مسلسل یہ جلسے قادیان میں ہوتے تھے اور
حضرتؒ اکثر بذاتِ خود ایک جماعت علماء دیوبند کے ساتھ اس میں شرکت فرماتے تھے۔
احقر ناکارہ بھی اکثر ان میں حاضر رہا ہے۔

شاہ صاحبؒ کو قتل کی دھمکیاں :

قادیانی گروہ نے اپنے آقاؤں (انگریزوں) کے ذریعہ ہر طرح اس کی کوشش کی
کہ یہ جلسے قادیان میں نہ ہو سکیں لیکن کوئی قانونی وجہ نہ تھی جس سے جلسے روک دیئے جاویں
کیونکہ ان جلسوں میں عالمانہ بیانات تہذیب و متانت کے ساتھ ہوتے اور کسی نقضِ امن
کے خطرہ کو موقع نہ دیتے تھے۔ جب قادیانی گروہ اس میں کامیاب نہ ہوا تو خود تشدد پر اتر
آیا۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اور ان کے رفقاء کو قادیان جانے سے پہلے اکثر ایسے

خطوط گمنام ملا کرتے تھے کہ اگر قادیان میں قدم رکھا تو زندہ واپس نہ جا سکو گے اور یہ صرف
دھمکی ہی نہ تھی، بلکہ عملاً بھی اکثر اس قسم کی حرکتیں ہوتی تھیں کہ باہر سے جانے والے علماء و
مسلمانوں پر حملے کئے جاتے تھے، ایک مرتبہ آگ بھی لگائی گئی۔
لیکن حق کا چراغ کبھی پھونکوں سے بجھایا نہیں گیا۔ اس وقت بھی ان کے اخلاق
سوز حملے مسلمانوں کو ان جلسوں سے نہ روک سکے۔

تردیدِ مرزائیت میں تصانیف کا سلسلہ :

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم چند خدام جلسۂ قادیان میں حضرت شاہ صاحب کے
ساتھ حاضر تھے۔ صبح کی نماز کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اپنے مخصوص تلامذہ
حاضرین کو خطاب کر کے فرمایا کہ "زمانہ کو الحاد کے فتنوں نے گھیر لیا اور قادیانی دجال کا فتنہ
ان سب میں زیادہ شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اب ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی عمر و
توانائی کا بڑا حصہ اور درسِ حدیث کا اہم موضوع حنفیت و شافعیت کو بنائے رکھا۔ ملحدین
زمانہ کے وساوس کی طرف توجہ نہ دی، حالانکہ ان کا فتنہ مسئلہ حنفیت و شافعیت سے کہیں زیادہ
اہم تھا۔ اب قادیانی فتنہ کی شدت نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا تو میں نے اس کے متعلقہ
مسائل کا کچھ مواد جمع کیا ہے، اگر اس کو میں خود تصنیف کی صورت سے مدون کروں تو میرا
طرز ایک خالص علمی اصطلاحی رنگ کا ہے اور زمانہ قحط الرجال کا ہے۔ اس قسم کی تحریر کو نہ
صرف یہ کہ پسند نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا فائدہ بھی بہت محدود رہ جاتا ہے۔ میں نے مسئلہ
"قرأۃ فاتحۃ خلف الامام" پر ایک جامع رسالہ "فصل الخطاب" بزبانِ عربی تحریر
کیا۔ اہلِ علم اور طلباء میں عموماً مفت تقسیم کیا لیکن اکثر لوگوں کو یہی شکایت کرتے سنا کہ پوری
طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے اگر آپ لوگ کچھ ہمت کریں تو یہ مواد میں آپ کو
دیدوں۔ اس وقت حاضرین میں چار آدمی تھے۔ احقر ناکارہ اور حضرت مولانا سید مرتضیٰ

حسن صاحبؒ سابق ناظم شعبہ تعلیم و تبلیغ دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا بدر عالم صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند و جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سورت و دارالعلوم ٹنڈو الہیار سندھ و حال مہاجر مدینہ طیبہ اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند و شیخ الجامعہ بہاولپور و حال شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور ادام اللہ تعالیٰ فیوضہم۔ ہم چاروں نے عرض کیا کہ جو حکم ہو ہم امتثال امر کو سعادت کبریٰ سمجھتے ہیں۔

فتنۂ قادیانیت کے استیصال کے لئے عملی کام :

اسی وقت فرمایا کہ اس فتنہ کے استیصال کے لئے عملی طور پر تین کام کرنے ہیں۔
اول مسئلہ ختم نبوت پر ایک محققانہ مکمل تصنیف جس میں مرزائیوں کے شبہات و اوہام کا ازالہ بھی ہو۔

دوسرے حیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ کی مکمل تحقیق قرآن و حدیث اور آثار سلف سے مع ازالہ شبہات ملحدین۔

تیسرے خود مرزا کی زندگی، اس کے گرے ہوئے اخلاق اور متعارض و متہافت اقوال اور انبیاء و اولیاء و علماء کی شان میں اس کی گستاخیاں اور گندی گالیاں، اس کا دعویٰ نبوت و وحی اور متضاد قسم کے دعوے۔ ان سب چیزوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ اس کی کتابوں سے مع حوالہ جمع کرنا جس سے مسلمانوں کو اس فرقہ کی حقیقت معلوم ہو اور اصل یہ ہے کہ اس فتنہ کی مدافعت کے لئے یہی چیز اہم اور کافی ہے، مگر چونکہ مرزائیوں نے مسلمانوں کو فریب میں ڈالنے کے لئے خواہ مخواہ کچھ علمی مسائل میں عوام کو الجھا دیا ہے اس لئے ان سے بھی اغماض نہیں کیا جا سکتا۔ پھر فرمایا کہ مسئلہ ختم نبوت کے متعلق تو یہ صاحب (احقر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) ایک جامع رسالہ عربی زبان میں لکھ چکے ہیں اور اردو میں لکھ رہے ہیں اور آخر الذکر معاملہ کے متعلق مواد فراہم کر کے مدون کرنے کا سے

بہتر کام حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کر سکیں گے کہ اس معاملہ میں ان کی معلومات بھی کافی ہیں اور مرزائی کتابوں کا پورا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہے، وہ اس کام کو اپنے ذمہ لے کر جلد سے جلد پورا کریں۔

مسئلہ رفع و حیات عیسیٰؑ :

اب مسئلہ رفع و حیات عیسیٰ علیہ السلام رہ جاتا ہے۔ اس کے متعلق میرے پاس کافی مواد جمع ہے۔ آپ تینوں صاحب دیوبند پہنچ کر مجھ سے لے لیں اور اپنے اپنے طرز پر لکھیں۔

یہ مجلس ختم ہو گئی مگر حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے قلبی تاثرات اپنا ایک گہرا نقش ہمارے دلوں پر چھوڑ گئے۔ دیوبند واپس آتے ہی ہم تینوں حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسئلہ حیات عیسیٰؑ سے متعلقہ مواد حاصل کیا۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب دامت برکاتہم نے آیت انی متوفیک و رافعک الیّ کی تفسیر سے متعلقہ مواد لے کر اس پر ایک مستقل رسالہ اردو میں بنام الجواب الفصیح لمنکر حیات المسیح تحریر فرمایا جو علمی رنگ میں لاجواب سمجھا گیا اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے پسند فرما کر اس پر تقریظ تحریر فرمائی۔ یہ رسالہ ۱۳۴۲ھ میں شعبہ تبلیغ دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوا۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب دامت فیوضہم نے اپنے مخصوص انداز میں اسی مسئلہ پر اردو زبان میں ایک جامع اور محققانہ رسالہ بنام کلمۃ اللہ فی حیاۃ روح اللہ تصنیف فرما کر حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرتؒ نے بے حد پسند فرما کر تقریظ تحریر فرمائی اور ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے شائع ہو کر مقبول و منظور خلائق ہوا۔

احقر ناکارہ کے متعلق یہ خدمت کی گئی کہ جتنی مستند ومعتبر روایات حدیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات یا نزول فی آخر الزمان کے متعلق وارد ہوئی ہیں، ان سب کو ایک رسالہ میں جمع کردے۔ احقر نے تعمیل حکم کے لئے رسالہ **التصریح بما تواتر فی نزول المسیح** بزبان عربی لکھا اور حضرت شاہ صاحبؒ کی بے حد پسندیدگی کے بعد اس سال شائع ہوا۔

ختم نبوت پر مستقل کتاب:

اس کے بعد حسب ارشاد مسئلہ ختم نبوت پر ایک مستقل کتاب اردو زبان میں تین حصوں میں لکھی:

پہلا حصہ ختم النبوۃ فی القرآن جس میں ایک سو آیات قرآنی سے اس مسئلہ کا مکمل ثبوت اور ملحدوں کے شبہات کا جواب لکھا گیا ہے۔

دوسرا ختم النبوۃ فی الحدیث جس میں دو سو دس احادیث معتبرہ سے اس مضمون کا ثبوت اور منکرین کا جواب پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا ختم النبوۃ فی الآثار جس میں سینکڑوں اقوال صحابہ وتابعین اور ائمہ دین اس کے ثبوت اور منکرین اور ان کی تاویلات باطلہ پر رد کے متعلق نہایت صاف وصریح نقل کئے گئے ہیں۔ یہ تینوں رسالے پہلی مرتبہ ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۵ھ تک شائع ہوئے۔ اسی کے ساتھ مختصر رسالہ دعاوی مرزا اور مسیح موعود کی پہچان اردو زبان میں احقر نے لکھ کر پیش کئے۔ ان رسائل کا جو کچھ نفع مسلمانوں کی اصلاح وہدایت اور ملحدین منکرین پر اتمام حجت کے سلسلہ میں ہوا یا ہوگا، اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے مجھے تو اپنی محنت کا نقد صلہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی مسرت وخوشنودی اور بے شمار دعاؤں سے اسی وقت مل گیا اور جوں جوں ان رسائل کی اشاعت سے مسلمانوں کی ہدایت بلکہ بہت سے قادیانی خاندانوں کی توبہ ورجوع الی الاسلام

کے متعلق حضرت کو معلوم ہوئے، اسی طرح اظہار مسرت اور دعا کے انعامات ملتے رہے۔

مولانا مرتضیٰ حسن کی تصانیف:

مخدومنا حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ جو عمر اور طبقہ کے اعتبار سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ سے مقدم تھے لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کے محیر العقول علم کے بے حد معتقد اور آپ کے ساتھ معاملہ بزرگوں کا سا کرتے تھے، جو خدمت اس سلسلہ کی ان کے سپرد فرمائی تھی۔ اس کو آپ نے بڑی سعی بلیغ کے ساتھ انجام دینا شروع کیا اور مرزا قادیانی کی پوری زندگی، اس کے اخلاق واعمال اور عقائد وخیالات، دعویٰ نبوت ورسالت اور تکفیر عام اہل اسلام، گستاخی درشان انبیاء واولیا کو مرزا کی اپنی کتابوں سے بحوالہ صفحہ سطر نہایت انصاف اور احتیاط کے ساتھ نقل کر کے بہت سے رسائل تصنیف فرمائے اور حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کے سامنے پیش فرما کر ان کی مراد پوری فرمائی۔ ان رسائل میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں:

قادیان میں قیامت خیز بھونچال **اشد العذاب علی مسیلمۃ البنجاب** فتح قادیان مرزائیوں کی تمام جماعتوں کو چیلنج 'مرزائیت کا خاتمہ' مرزائیت کا جنازہ بے گوروکفن' ہندوستان کے تمام مرزائیوں کو چیلنج، مرزا اور مرزائیوں کو دربار نبوت سے چیلنج۔ یہ سب رسائل ۱۳۳۲ھ سے ۱۳۴۳ھ تک شائع ہوئے۔

تاریخی مناظرہ:

اسی زمانہ میں چھاؤنی فیروز پور پنجاب میں قادیانیوں کا ایک خاصہ جتھہ جمع ہوگیا تھا۔ یہ لوگ وہاں کے مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے اور اپنے دستور کے موافق عوام مسلمانوں کو مناظرہ ومباحثہ کا چیلنج کیا کرتے اور جب کسی عالم سے مقابلہ کی نوبت آتی

تو راہ گریز اختیار کرتے۔ اسی زمانہ میں ضلع سہارنپور کے رہنے والے کچھ مسلمان جو فیروز پور میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے، ان لوگوں نے روز روز کی جھک جھک کو ختم کرنے کے لئے خود قادیانیوں کو دعوت مناظرہ دیدی۔

قادیانیوں نے سادہ لوح عوام سے معاملہ دیکھ کر بڑی دلیری اور چالاکی کے ساتھ دعوت مناظرہ قبول کر کے بجائے اس کے کہ مناظرہ کرنے والے علماء سے شرائط مناظرہ طے کرتے، انہیں عوام سے ایسی شرائط مناظرہ پر دستخط لے لئے جن کی رو سے فتح بہرحال قادیانی گروہ کی ہو اور اہل اسلام کو مقررہ شرائط کی پابندی کی وجہ سے ہر قدم پر مشکلات درپیش ہوں۔ ان عوام مسلمین نے مناظرہ اور شرائط مناظرہ طے کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند سے چند علماء کو دعوت دی جو قادیانیوں سے مناظرہ کریں۔

مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت شاہ صاحب کے مشورہ سے اس کام کے لئے حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ، حضرت مولانا بدر عالم صاحب، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب اور احقر تجویز ہوئے۔ ادھر قادیانیوں نے یہ دیکھ کر کہ ہم نے اپنی من مانی شرائط میں مسلم مناظرین کو جکڑ لیا ہے، اپنی قوت محسوس کی وہ قادیان کی پوری طاقت فیروز پور میں لا ڈالی۔ ان کے سب سے بڑے عالم اس وقت سرور شاہ کشمیری اور سب سے بڑے مناظر حافظ روشن علی اور عبدالرحمٰن مصری وغیرہ تھے۔ یہ سب اس مناظرہ کے لئے فیروز پور پہنچ گئے۔

شاہ صاحب کو مناظرے کی اطلاع :

ہم چار افراد حسب الحکم دیوبند سے فیروز پور پہنچے تو یہاں پہنچ کر چھپا ہوا پروگرام مناظرہ اور شرائط مناظرہ کا نظر سے گذرا۔ شرائط مناظرہ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ان میں ہر حیثیت سے قادیانی گروہ کے لئے آسانیاں اور اہل اسلام کے لئے ہر طرح کی بے جا

پابندیاں عوام نے اپنی ناواقفیت کی بناء پر تسلیم کی ہوئی ہیں۔ اب ہمارے لئے دو ہی راستے تھے کہ یا ان مسلم فریقین شرائط مناظرہ کے ماتحت مناظرہ کریں جو ہر حیثیت سے ہمارے لئے مضر تھیں یا پھر مناظرہ سے انکار کریں کہ ہم ان شرائط کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے جو بغیر ہماری شرکت کے طے کر لی گئی ہیں، لیکن دوسری شق پر مقامی مسلمانوں کی بڑی خفت اور سبکی تھی اور قادیانیوں کو اس پروپیگنڈے کا موقع ملتا کہ علماء نے مناظرہ سے فرار کیا، اس لئے ہم نے سب سے مشورہ کر کے مناظرہ کرنے کا تو فیصلہ کر لیا اور بذریعہ تار صورت حال کی اطلاع حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو دے دی۔

ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں :

اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہو گیا۔ ابھی شروع ہی تھا، عین مجلس مناظرہ میں نظر پڑی کہ حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ مع چند دیگر علماء کے تشریف لا رہے ہیں۔ ان کی آمد پر ہم نے کچھ دیر کے لئے مجلس مناظرہ ملتوی کی اور ان حضرات کو صورت حال بتلائی۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا کہ جا کر ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم نے جتنی شرطیں اپنی پسند کے موافق عوام سے طے کرائی ہیں، اتنی ہی اور لگا لو، ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں۔ تم چوروں کی طرح عام ناواقف مسلمانوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے عادی ہو، کسی شرط اور کسی طریق پر ایک مرتبہ سامنے آ کر اپنے دلائل بیان کرو اور ہمارا جواب سنو پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو۔

حضرت امام کشمیریؒ کے ارشاد کے موافق اسی کا اعلان کر دیا گیا اور مناظرہ جاری ہوا۔ ان اکابر کو مناظرہ کے لئے پیش کرنا ہماری غیرت کے خلاف تھا۔ اس لئے پہلے دن مناظرہ مسئلہ ختم نبوت پر احقر نے کیا۔ دوسرے تیسرے دن حضرت مولانا بدر عالم اور مولانا محمد ادریس صاحب نے دوسرے مسائل پر مناظرہ کیا۔

قادیانی رسوا ہوئے :

یوں تو مناظرہ کے بعد ہر فریق اپنی اپنی کہا ہی کرتا ہے، لیکن اس مناظرہ میں چونکہ عموماً تعلیم یافتہ طبقہ شریک تھا، اس لئے کسی فریق کو دھاندلی کا موقع نہ تھا، پھر اس مناظرہ کا کیا اثر ہوا۔ اس کا جواب فیروز پور کے ہر گلی کوچہ سے دریافت کیا جا سکتا تھا کہ قادیانی گروہ کو کس قدر رسوا ہو کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ خود اس گروہ کے تعلیم یافتہ و سنجیدہ طبقہ نے اس کا اقرار کیا کہ قادیانی گروہ اپنے کسی دعوے کو ثابت نہیں کر سکا اور اس کے خلاف دوسرے فریق نے جوابات بھی قوی دلیل کے ساتھ کہی۔

مناظرہ کے بعد شہر میں ایک جلسۂ عام ہوا، جس میں حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہما کی تقریریں قادیانی مسئلہ کے متعلق ہوئیں یہ تقریریں فیروز پور کی تاریخ میں ایک یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ جو قادیانی دجل کے شکار ہو چکے تھے، اس مناظرہ اور تقریروں کے بعد اسلام پر لوٹ آئے۔

حضرت شاہؒ صاحب کا دورۂ پنجاب :

۱۳۴۳ھ میں جب کہ حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کی کوشش سے بذریعہ تصنیف و تحریر قادیانی دجل و فریب کا پردہ پوری طرح چاک کر دیا گیا اور قادیانیت سے متعلق ہر مسئلہ پر مختلف طرز و انداز کے بیسیوں رسائل شائع ہو چکے تو آپ نے اس کی بھی ضرورت محسوس فرمائی کہ ناخواندہ عوام کا طبقہ جو زیادہ کتابیں نہیں پڑھتا اور قادیانی مبلغین چل پھر کر ان میں اپنا دجل پھیلاتے ہیں اور مناظرہ مباہلہ کے جھوٹے چیلنج ان کو دکھاتے پھرتے ہیں، ان لوگوں کی حفاظت کے لئے پنجاب کے مختلف شہروں کا ایک تبلیغی دورہ کیا جائے۔

پنجاب و سرحد کے دورہ کا پروگرام بنا۔ علماء دیوبند کی ایک جماعت ہمرکاب ہوئی اس جماعت میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اکابرین سے حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ شریک تھے اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند' حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ادریس صاحبؒ اور مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانویؒ اور احقر [illegible] بھی شامل تھے۔ یہ علم کے پہاڑ اور تقوے کے پیکر، پنجاب کے ہر بڑے شہر میں پہنچے اور مرزائیت کے متعلق اعلانِ حق کیا۔ منکرین کو رفع شبہات کی دعوت دی۔ لدھیانہ' امرتسر' گوجرانوالہ' گجرات' راولپنڈی' ایبٹ آباد' مانسہرہ ہزارہ' کھونہ وغیرہ میں ان حضرات کی بصیرت افروز عالمانہ تقریریں ہوئیں۔ مرزائی دجال جو آئے دن مناظرہ و مباہلہ کے چیلنج عوام کو دکھانے کے لئے پھرا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک سامنے نہ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جہان میں نہیں ہیں۔

اس پورے سفر میں عام مسلمانوں نے جاء الحق و زهق الباطل کا منظر گویا آنکھوں سے دیکھ لیا۔

بہاولپور کا معرکۃ الآراء تاریخی مقدمہ :

حضرت شاہ صاحبؒ اور دیگر اکابر علماء کے بیانات'

مرزائیوں کے مرتد ہونے کا فیصلہ

۱۹۲۶ء میں احمد پور شرقیہ ریاست بہاولپور کی ایک مسلمان عورت کا دعویٰ اپنے شوہر کے مرزائی ہو جانے کی وجہ سے نکاح فسخ ہونے کے متعلق بہاولپور کی عدالت میں دائر ہوا اور سات سال تک یہ مقدمہ بہاولپور کی ادنیٰ اعلیٰ عدالتوں میں دائر رہتے ہوئے آخر

میں دربار معلی بہاولپور میں پہنچا۔ ۱۹۳۳ء میں دربار معلےٰ نے پھر عدالت میں یہ لکھ کر واپس کیا کہ ہمارے خیال میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق و تنقیح کرنا ضروری ہے۔ دونوں فریق کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے علماء کی شہادتیں پیش کریں اور دونوں طرف کے مکمل بیانات سننے کے بعد اس مسئلہ کا کوئی آخری فیصلہ کیا جائے۔

اب مدعٰی علیہ مرزائی نے اپنی حمایت کے لئے قادیان کی طرف رجوع کیا۔ قادیان کا بیت المال اور اس کے رجال کار مقدمہ کی پیروی کے لئے وقف ہو گئے۔ ادھر مدعیہ بے چاری ایک غریب گھرانے کی لڑکی نہایت کسمپرسی میں وقت گذار رہی تھی۔ اس کی قدرت سے قطعاً خارج تھا کہ ملک کے مشاہیر علماء کو جمع کر کے اپنی شہادت میں پیش کر سکے یا اس مقدمہ کی پیروی کر سکے۔ مگر الحمد للہ بہاولپور کے غیور مسلمانوں کی انجمن مؤید الاسلام نے زیر سرپرستی حضرت مولانا محمد حسین صاحب شیخ الجامعہ بہاولپور اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مقدمہ کی پیروی کا انتظام کیا اور ملک کے مشاہیر علماء کو خطوط لکھ کر اس مقدمہ کی پیروی اور شہادت کے لئے طلب کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ اس وقت جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں صدر مدرسی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور کچھ عرصہ سے علالت کے سبب رخصت پر دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے۔ طویل علالت سے نقاہت بے حد ہو چکی تھی۔

بیماری کے باوجود بہاولپور کا سفر:

لیکن جس وقت یہ معاملہ آپ کے سامنے آیا تو مسئلہ کی نزاکت اور دینی حمیت کے قوی احساس نے آپ کو اس کے لئے مجبور کر دیا کہ اپنی صحت اور دوسری ضرورتوں کا خیال کئے بغیر وہ بہاولپور کا سفر کریں۔ آپ نے نہ صرف اپنے آپ کو شہادت کے لئے پیش فرمایا، بلکہ ملک کے دوسرے علماء کو بھی ترغیب دے کر شہادت کے لئے جمع فرمایا۔

یہ واقعہ تقریباً ۱۳۵۰ھ کا ہے، جبکہ احقر ناکارہ بحیثیت مفتی دارالعلوم دیوبند فتویٰ

نویسی کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

انجمن مؤید الاسلام بہاولپور کی دعوت کے علاوہ استاذ محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کا ایماء بھی میری حاضری کے متعلق معلوم ہوا۔ احقر نے حاضری کا قصد کر لیا۔ لیکن حضرت الاستاذ شاہ صاحب قدس سرہٗ کو جو خداداد شغف دینی ضرورتوں کے ساتھ تھا اور آپ کو بے چین کئے رکھتا تھا۔ اس کی وجہ سے آپ نے تاریخ مقدمہ سے کافی روز پہلے بہاولپور پہنچ کر اس کام کو پوری توجہ کے ساتھ انجام دینے کا فیصلہ فرما کر سب بیانات کے اختتام تک تقریباً بیس پچیس روز بہاولپور میں قیام فرمایا۔

ختم نبوت کا مقدمہ لڑنے کے لئے سفر حج ملتوی کر دیا:

بہاولپور کے ایک بزرگ تھے مفتی محمد صادقؒ، انہوں نے چار ورق خط لکھا حضرت کشمیریؒ کو کہ ہمارے ہاں قادیانیت کا فتنہ ہے، بچی مسلمان ہے شوہر قادیانی ہو گیا ہے۔ کیس عدالت میں ہے اور آپ ہماری مدد کریں۔ یہ خط حضرت انور شاہ کشمیریؒ نے پڑھا تو حج کے لئے تیار تھے۔ اب ایک بندے نے حج کا ارادہ کر رکھا ہے، سامان تیار ہے، رفقاء تیار ہیں، وفد تیار ہے، خط پڑھنے کے بعد پانچ چھ منٹ خط کو دیکھا خط بند کیا تو حاضرین سے کہنے لگے کہ آپ حج پر جائیں، میں تو حج پہ نہیں جا سکتا۔ رفقاء نے کہا کہ حضرتؒ! آپ کی رفاقت کی بناء پر تو ہم تیار ہوئے ہیں کہ آپ کے ساتھ ہمارا حج ہو جائے گا۔ ہم تو تیاری آپ کی خاطر ہوئے ہیں تھے۔ فرمانے لگے کہ بہاولپور کے ایک عالم دین کا خط آیا ہے۔ ایک مسلمان بچی کے تنسیخ نکاح کا مسئلہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قادیانیت کے ارتداد و کفر کا مسئلہ ہے اور ختم نبوت کے اعتقاد کا مسئلہ ہے تو خط کھول کر یوں بند کرنے کے وقت میں نے زندگی کے پچھلے اعمال پر سوچا کہ اگر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پوچھ لے کہ کونسا عمل لائے ہو پچھلی زندگی میں کوئی عمل رکھتے ہو تو پیش کرو؟ تو سوچنے کے بعد میرے دماغ میں

کوئی ایسا عمل تازہ نہیں ہوا، جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کر سکوں۔ حج چھوڑتا ہوں، میں اب واپس جاؤں گا اور بہاولپور کیس کے سلسلے میں سفر کروں گا تا کہ قیامت کے دن حضور ﷺ کے منصب ختم نبوت کے تحفظ کرنے والوں میں شمار کیا جاؤں اور سمجھا جاؤں اور اس عمل کے صدقے میں میری بخشش ہو جائے اور اس کے ساتھ فرمانے لگے کہ دل میں یہ خیال بھی آیا کہ جا تو رہا ہوں حج کے لئے اور آگے سفر کروں گا مدینہ منورہ کا تو اللہ تعالیٰ کی رضا بھی چاہیے، حضور ﷺ کی شفاعت بھی چاہیے، فرمانے لگے کہ قیامت کے دن اگر حضور ﷺ پوچھ لیں کہ ضرورت وہاں تھی، آ یہاں گیا؟ ضرورت تو تیری بہاولپور میں تھی اور تو یہاں آ گیا؟ تو میرے پاس اس کا بھی کوئی جواب نہیں ہوگا۔ میں حضور ﷺ کے مقام ختم نبوت اور منصب ختم نبوت کی حفاظت کے لئے بہاولپور جاؤں گا۔

(ماہنامہ "لولاک" ملتان جنوری ۱۹۹۹ء از تقریر مولانا عزیز الرحمن جالندھری)

ضو سے اس خورشید کی اختر میرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبار راہ سے شرمندہ ہے

کمرۂ عدالت یا دیوبند کا دارالحدیث:

حضرت شاہ صاحبؒ کا پُر شوکت عالمانہ بیان جو کمرۂ عدالت میں ہوا، اس کی اصل کیفیت تو صرف انہی لوگوں کے دل سے پوچھئے، جنہوں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ اس وقت کمرۂ عدالت دارالعلوم دیوبند کا دارالحدیث نظر آتا تھا۔ عدالت اور حاضرین پر ایک سکتہ کا عالم تھا۔ علوم ربانی کے حقائق و معارف کا دریا تھا جو اُمڈا چلا جاتا تھا۔

تین روز مسلسل بیان ہوا۔ تقریباً ساٹھ صفحات پر قلم بند ہوا۔ یہ بیان اور دوسرے حضرات کے بیانات جو ایک مستقل جلد میں طبع ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ردِ مرزائیت کے لئے بلکہ اسلام و ایمان اور کفر و ارتداد کی پوری حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک نادر مجموعہ ہیں۔

اس مقدمہ میں کیا ہوا؟ اس کی پوری تفصیل تو اس مفصل فیصلہ سے معلوم ہو سکتی ہے جو عدالت کی طرف سے ۷/ فروری ۱۹۳۵ء مطابق ۳/ ذیقعدہ ۱۳۵۳ھ کو دیا گیا اور جو اسی وقت بزبان اردو ایک سو باون صفحات پر شائع ہو چکا تھا۔ اس کی اشاعت کا اہتمام حضرت مولانا محمد صادق صاحب استاد جامعہ عباسیہ بہاولپور حال ناظم اُمور مذہبیہ بہاولپور کے دست مبارک سے ہوا۔ اس مقدمہ کے پیروی علماء کے اجتماع ان کی ضروریات کا انتظام بھی مولانا موصوف ہی کے ہاتھوں انجام پایا تھا اور مولانا سے میرا پہلا تعلق اسی سلسلہ میں پیدا ہوا۔ آپ نے اس فیصلہ کے شروع میں ایک مختصر تمہید لکھی ہے۔ اس کے چند جملے نقل کر دینے سے کسی قدر حقیقت پر روشنی پڑ سکتی ہے وہ یہی ہیں:

"مدعیہ کی طرف سے شہادت کے لئے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ چاندپوری، حضرت مولانا محمد نجم الدین صاحبؒ پروفیسر اورئینٹل کالج لاہور و مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند پیش ہوئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تشریف آوری نے تمام ہندوستان کی توجہ کے لئے جذب مقناطیسی کا کام کیا۔ اسلامی ہند میں اس مقدمہ کو غیر فانی شہرت حاصل ہوگئی۔

حضرات علمائے کرام نے اپنی اپنی شہادتوں میں علم و عرفان کے دریا بہا دیئے، اور فرقۂ ضالہ مرزائیہ کا کفر و ارتداد روز روشن کی طرح ظاہر کر دیا اور فریق مخالف کی جرح کے نہایت مسکت جواب دیئے۔ خصوصاً حضرت شاہ صاحبؒ نے ایمان، کفر، نفاق، زندقہ، ارتداد، ختم نبوت، اجماع، تواتر، متواترات کے اقسام، وحی، کشف اور الہام کی تعریفات اور ایسے اُصول و قواعد بیان فرمائے جن کے مطالعہ سے ہر ایک انسان علیٰ وجہ البصیرت بطلان

مرزائیت کا یقین کامل حاصل کرسکتا ہے، پھر فریق ثانی کی شہادت شروع ہوئی، مقدمہ کی پیروکاری اور شہادت پر جرح کرنے اور قادیانی دجل وتزویر کو آشکارا کرنے کے لئے شہرۂ آفاق مناظر حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب نعمانی شاہ جہانپوری تشریف لائے۔ مولانا موصوف مختار مدعیہ ہوکر تقریباً ڈیڑھ سال مقدمہ کی پیروکاری فرماتے رہے۔ فریق ثانی کی شہادت پر ایسی باطل شکن جرح فرمائی جس نے مرزائیت کی بنیادوں کو کھوکھلا اور مرزائی دجل وفریب کے تمام پردوں کو پارہ پارہ کرکے فرقہ مرزائیہ ضالہ کا ارتداد آشکار عالم کردیا۔ فریقین کی شہادت ختم ہونے کے بعد مولانا موصوف نے مقدمہ پر بحث پیش کی اور فریق ثانی کی تحریری بحث کا تحریری جواب الجواب نہایت مفصل اور جامع پیش کیا۔

امام کشمیریؒ عدالت کے کمرہ میں :

۲۵ راگست ۱۹۳۲ء کو حضرتؒ کا بیان شروع ہوا، عدالت کا کمرہ امراء و رؤسائے ریاست اور فضلاء کی وجہ سے پُر تھا۔ عدالت کے بیرونی میدان میں دور دور تک زائرین کا اجتماع تھا۔ باوجودیکہ شاہ صاحبؒ عرصہ سے بیمار تھے اور جسم مبارک بہت ناتواں ہوچکا تھا مگر متواتر پانچ روز تک تقریباً پانچ پانچ گھنٹے یومیہ عدالت میں تشریف لاکر علم وعرفان کا دریا بہاتے رہے۔ مرزائیت کے کفر وارتداد ودجل وفریب کے تمام پہلو آفتاب نصف النہار کی طرح روشن فرمائے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان ساطع البرہان میں مسئلہ نبوت اور مرزا کے ادعاء نبوت ووحی ومدعی نبوت کے کفر وارتداد کے متعلق جس قدر مواد جمع ہے اور ان مسائل وحقائق کی توضیح وتفصیل کے لئے جو علمی مباحث موجود ہیں۔ شاید مرزائی نبوت کے رد میں اتنا علمی ذخیرہ کسی ضخیم کتاب میں یکجا نہیں ملے گا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان پر تبصرہ خاکسار کی فکر کی رسائی سے باہر ہے۔ ناظرین بہرہ اندوز ہوکر حضرت شاہ صاحبؒ

کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مدارج بلند فرمادیں۔ (آمین) (انوار انوری ص: [illegible] مولانا محمد انوری)

ہم سنگ سے ٹکرائیں تو شیشہ کی صدا ہیں
گل سے مقابل ہو تو شبنم کی صدا ہیں

مقدمے کا بصیرت افروز فیصلہ :

کامل دو سال کی تحقیق وتنقیح کے بعد عالی جناب ڈسٹرکٹ جج صاحب بہادر نے اس تاریخی مقدمہ کا بصیرت افروز فیصلہ ۷ رفروری ۱۹۳۵ء بحق مدعیہ سنایا۔ یہ فیصلہ اپنی جامعیت اور قوت استدلال کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر وبے عدیل ہے۔

اس مقدمہ میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے حکم کی بناء پر پہلا بیان اس احقر کا ہوا۔ تین روز بیان اور ایک دو روز جرح ہوکر تقریباً ساٹھ صفحات پر بیان مرتب ہوا۔

پہلا پہلا بیان تھا۔ ابھی لوگوں نے اکابر کے بیان سنے نہ تھے، سب نے بیحد پسند کیا، مجھے یاد ہے کہ دوران بیان میں بھی اور مکان پر آنے کے بعد بھی حضرت شاہ صاحب قدس سرہ دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کے ساتھ اپنی مسرت کا اظہار فرماتے تھے اور اس ناکارہ وآوارہ کے پاس دین ودنیا کا صرف یہی سرمایہ ہے کہ اللہ والوں کی رضا' رضائے حق کی علامت ہے۔

امام کشمیریؒ کی کرامت :

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے صاحبزادے قمطراز ہیں :

مقدمہ بہاولپور وہ پہلا مقدمہ تھا جس میں قادیانیوں کو عدالتی سطح پر غیر مسلم قرار دیا گیا۔ چنانچہ اس مقدمے کا فیصلہ اپنے حق میں کرانے کے لئے قادیانیوں نے اپنا سارا زور

صرف کر دیا تھا۔

اُدھر جب حضرت شاہ صاحبؒ کو اس کی اطلاع ہوئی کہ ایسا مقدمہ زیر سماعت ہے تو آپ نے بہ نفس نفیس وہاں تشریف لے جانے کا ارادہ فرمالیا اور اس غرض کے لئے آپ نے جو رفقاء منتخب فرمائے، ان میں حضرت والد صاحبؒ بھی شامل تھے۔ اتفاق سے ان دنوں حضرت والد صاحبؒ اپنے والد ماجد (حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب) کی علالت کی وجہ سے ذہنی طور پر مشوش اور فکر مند تھے، لیکن جب حضرت شاہ صاحب نے بہاولپور جانے کے لئے فرمایا تو تیار ہو گئے، لیکن قیام بہاولپور کے زمانے ہی میں اچانک والد صاحبؒ کے پاس دیوبند سے تار آیا کہ:

"آپ کے والد کی طبیعت زیادہ خراب ہے، جلدی واپس آ جائیں"۔

حضرت والد صاحبؒ یہ تار حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس لے گئے۔ حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت میں سخت تردد کی حالت میں تھا۔ ایک طرف والد ماجدؒ کی صحت کی طرف سے پریشانی تھی اور اس تار کا تقاضا یہ تھا کہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر واپس چلا جاؤں۔

دوسری طرف ایسے اہم کام میں حضرت شاہ صاحبؒ کی رفاقت کی جو سعادت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی اسے چھوڑتے ہوئے دل کٹ رہا تھا اور خیال یہ تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ اس تار کو دیکھ کر واپسی کی اجازت دے دیں گے، کیونکہ ہمارے اکابر عام طور سے ان باتوں میں بہت رعایت فرماتے ہیں، لیکن اس روز حضرت شاہ صاحبؒ کی کرامت ظاہر ہوئی۔ حضرتؒ نے تار کا مضمون سننے کے بعد بڑے اعتماد کے ساتھ فرمایا:

"ہم آپ کے والد صاحبؒ کے لئے دعا کریں گے' ان شاء اللہ وہ تندرست ہو جائیں گے' آپ بے فکر ہو کر یہاں اپنا کام کریں"۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی زبان سے یہ جملہ سن کر میرے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی اور ساری تشویش اور پریشانی کافور ہو گئی، پھر حضرتؒ نے خود والد صاحبؒ کے نام اس مضمون کا تار روانہ کیا کہ:

"مولوی شفیع صاحب کی یہاں ضرورت ہے میں نے انہیں روک لیا ہے، ہم سب آپ کی صحت کے لئے دعا کر رہے ہیں"۔

اور پھر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے والد صاحب کی طبیعت بھی بہتر ہو گئی"۔

(البلاغ مفتی اعظم نمبر ص ۳۹۱، ۳۹۲)

فیصلہ میری قبر پر آ کر سنایا جائے:

ریاست بہاولپور میں قادیانیوں کے کفر و اسلام کا ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ جب وہ آخری مراحل میں پہنچا تو شیخ الجامعہ حضرت مولانا محمد گھوٹوی اور حضرت مفتی صادق صاحبؒ اور تمام علماء نے استدعا کی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک علمی بیان عدالت میں ہونا چاہئے۔ شاہ صاحبؒ ان دنوں خونی بواسیر کے تحت مریض تھے۔ ڈاکٹروں' حکیموں نے سفر سے بالکل روک دیا تھا، کمزوری بہت ہو چکی تھی، لیکن جونہی شاہ صاحبؒ کو دعوت پہنچی' آپ سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ بہاولپور سے مفتی صادق صاحب خود انہیں لینے کے لئے دیوبند گئے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر قیامت کے روز حضور ﷺ نے یہ سوال کر لیا کہ میری ختم نبوت کا مقدمہ پیش تھا' تجھے طلب کیا گیا اور تو نہیں گیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ موت تو آنی ہی ہے' اگر اسی راستہ میں آ گئی تو اس سے بہتر اور کیا ہو گا، تو حکیموں کے روکنے کے باوجود آپ تشریف لے گئے۔ جج صاحب جن کا محمد اکبر نام تھا، وہ شاہ صاحبؒ کا بہت احترام کرتا تھا۔ آپ کو عدالت میں کرسی مہیا کی گئی اور حضرت شاہ صاحبؒ کا آخری معرکۃ الآراء بیان ہوا' اور قادیانیوں کی طرف سے اس پر جرح ہوتی

رہی اور شاہ صاحبؒ جواب دیتے رہے۔ جب حضرت شاہ صاحبؒ کا بیان اور جرح ہوئی ختم ہوئی۔

غلام احمد قادیانی کو جہنم میں جلتا ہوا دکھاؤں:

تو حضرت شاہ صاحبؒ نے قادیانیوں کے بڑے مناظر جلال الدین شمس کا ہاتھ پکڑا اور بڑے جوش سے فرمایا کہ جلال الدین اگر اب بھی تمہیں قادیانی کے کفر میں شبہ ہو تو آؤ میں تمہیں اسے جہنم میں جلتا ہوا دکھاؤں، یہ سن کر اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑایا اور کہنے لگا کہ اگر آپ دکھا بھی دیں تو میں کہوں کہ یہ استدراج یعنی کوئی شعبدہ بے حقیقت ہیں۔

ہمارے حضرات کہتے ہیں کہ وہ بد بخت تھا' اگر ہاں کر لیتا تو حضرت شاہ صاحبؒ پر اس وقت ایسی جذب کی حالت تھی کہ وہ اسے کشفاً جہنم میں جلتا ہوا دیکھ رہے تھے اور دکھا بھی سکتے تھے۔

مقدمہ کی سماعت ہو جانے کے بعد جب حضرت شاہ صاحبؒ دیو بند جانے لگے تو مولانا مفتی محمد صادقؒ اور دیگر علماء کو وصیت فرمائی کہ مقدمہ کا فیصلہ اگر تو میری زندگی میں ہو گیا تو میں سن لوں گا' اگر یہ فیصلہ میری وفات کے بعد ہو تو میری قبر پر آ کر سنایا جائے۔ چنانچہ حضرت کی واپسی کے بعد آپ کی جلد وفات ہو گئی اور یہ فیصلہ آپؒ کی وفات کے بعد ہوا اور حضرت محمد صادق صاحبؒ حضرت شاہ صاحبؒ کی وصیت کے مطابق خصوصی طور پر دیو بند گئے اور شاہ صاحبؒ کی قبر پر کھڑے ہو کر یہ فیصلہ سنایا۔ الحمد للہ فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا تھا۔

اس واقعہ سے آپ اندازہ لگائیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو کتنی فکر اور کتنا لگاؤ اس مسئلہ سے تھا کہ وفات کے بعد بھی جبکہ وہ عالم برزخ میں چلے گئے تھے، وہاں بھی آپ کو اس کا انتظار تھا۔ یہ اس وقت کے مسلمانوں کو اس فتنہ کے استیصال کی طرف متوجہ کرنے

کی ایک صدا تھی جو شاہ صاحبؒ نے وصیت کی شکل میں بلند کی۔

(چراغ ہدایت ص ۳۳، ۳۵، از مولانا محمد حیات فاتح قادیان تقریظ مولانا منظور احمد چنیوٹی)

ڈھونڈا تو بہت لیکن پایا نہ کوئی تجھ سا
اک مدت اسی کوشش میں دمساز گنوائی ہے

امام کشمیریؒ کے ایک خادم کا اعلان:

سنا تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ یہ شنید اس وقت دید میں بدل گئی، جب قادیانیوں کے جشن صد سالہ کی رٹ جسٹس خلیل الرحمن خان کی عدالت میں زیر سماعت تھی۔ اس عدالت میں بھی عدالت بہاولپور کی تاریخ دہرائی گئی' جس طرح وہاں مرزائیوں کا وکیل جلال الدین شمس' محدث العصر سید انور شاہ کشمیریؒ کے روبرو خائب و خاسر ہو کر فرار ہوا تھا' اسی طرح اس عدالت میں مرزائیوں کا وکیل مجیب الرحمن' مجاہد ختم نبوت جناب رشید مرتضیٰ قریشی صاحب کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوا۔ دوران سماعت ایک دن یوں ہوا کہ جب بحث طول پکڑ گئی تو جناب رشید مرتضیٰ قریشی عدالت میں کھڑے ہوئے اور پر جلال انداز میں فرمایا کہ جناب عالی ! یہ بحث آج ہی ختم ہو جاتی ہے، میں انور شاہ کشمیریؒ تو نہیں' ان کا ادنیٰ خادم ہوں' لیکن جس ذات پہ ان کا بھروسہ تھا' اسی ذات پہ بھروسہ کرتے ہوئے آج رشید مرتضیٰ قریشی اعلان کرتا ہے کہ اگر مجیب الرحمن میرے ہاتھوں میں ہاتھ دے تو میں اسے اسی عدالت میں مرزا قادیانی کو جہنم میں جلتے دکھا سکتا ہوں۔

یہ سننا تھا کہ عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ رشید مرتضیٰ صاحب نے بار بار چیلنج دیا مگر اس کا جواب نہ آنا تھا نہ آیا۔ اسلام ایک دفعہ پھر سربلند رہا اور باطل منہ کے بل گر کے رہا۔ بے شک ان الباطل کان زھوقا۔

(ہمیں ختم نبوت سے عشق تھا ص ۴۳)

فتنہ مرزائیت پر حضرت شاہ صاحبؒ کی اپنی تصانیف :

مرزائیت کے متعلق تمام ضروری مسائل پر کافی سے زائد رسائل و کتب حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے ارشاد و ایماء کی بناء پر لکھے جا چکے تھے۔ لیکن ایک مسئلہ ہنوز تشنہ باقی تھا کہ مرزائیوں کے نماز، روزہ اور تلاوت قرآن اور کلمۂ اسلام پڑھنے سے عام مسلمانوں اور خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ کو سخت اشتباہ تھا کہ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے ان کو اسلام سے خارج کیسے کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں بعض اہل علم کو بھی یہ اشکال تھا کہ اہل قبلہ اور کلمہ گو کی تکفیر نیز جو شخص کسی تاویل کی بناء پر خلاف شرع عقیدے کا قائل ہو، اس کی تکفیر میں علمائے اہل حق نے بہت کلام کیا ہے۔ اس لئے اس مسئلہ پر حضرت الاستاذ شاہ صاحب قدس سرہ نے خود قلم اٹھایا اور ایک رسالہ بنام اکفار الملحدین و المتاولین فی شئی من ضروریات الدین جس میں اس مسئلہ کو قرآن و حدیث اور تصریحات سلف کی روشنی میں آفتاب نصف النہار کی طرح واضح فرما دیا۔

بلکہ کفر و ایمان کی مکمل حقیقت، اہل قبلہ اور کلمہ گو کی شرعی تعریف پر ایک نہایت جامع تصنیف فرما دی، جس میں اس بات کو بھی واضح کر دیا گیا کہ اگر کسی عقیدۂ کفریہ میں مطلقاً تاویل کو مانع کفر قرار دیا جائے تو دنیا میں کوئی کافر نہیں رہ سکتا کیونکہ ہر کافر کچھ نہ کچھ تاویل اپنے عقیدۂ فاسدہ کی کرتا ہے۔ بلکہ فیصلہ یہ ہے کہ اسلام کے وہ احکام جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں (جن کو اصطلاح فقہ و کلام میں ضروریات دین کہا جاتا ہے) جیسے ان کا انکار صریح کفر و ارتداد ہے۔ اسی طرح تاویل کر کے جمہور امت کے خلاف ان کے نئے معنی بتانا بھی کفر و ارتداد ہے (یہ کتاب عربی زبان میں ہے)

عقیدۃ الاسلام فی نزول عیسیٰ علیہ السلام :

ایک دوسری مستقل کتاب مسئلہ حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی اپنے قلم سے بزبان عربی تصنیف فرمائی۔ جس کا نام "عقیدۃ الاسلام فی نزول عیسیٰ علیہ السلام" رکھا۔ یہ کتاب کہنے کو تو اسی ایک مسئلہ کی بہترین و جامع تحقیق ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر و تحریر کو جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک مسئلہ کے ضمن میں کتنے علوم و معارف کے ابواب آ جاتے ہیں۔ یہ کتاب بھی اپنے موضوع کی عجیب و غریب تصنیف ہے۔

مقدمہ بہاولپور سے واپسی کے بعد مرض روز بروز شدت پکڑتا گیا، لیکن اسی حالت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے درس حدیث کو جاری رکھا۔ تا آنکہ قویٰ نے بالکل جواب دے دیا اور آپ دیوبند تشریف لا کر گویا صاحب فراش ہو گئے اور یہی مرض مرض الموت ثابت ہوا۔ لیکن قدرت نے جو دینی خدمت کا جذبۂ بے پایاں آپ کے قلب مبارک میں ودیعت فرمایا تھا، وہ بستر مرگ پر بھی چین سے نہ لیٹنے دیتا تھا۔ افادات علمیہ اور کتب بینی کا سلسلہ اس حالت میں بھی اسی طرح جاری تھا۔

خاتمۃ التصانیف :

تا آنکہ یہ ارادہ ہوا کہ ایک مرتبہ پھر کشمیر کا سفر کیا جائے۔ وہاں اپنے اعزہ و اقارب کی ملاقات کے علاوہ پیش نظر یہ تھا کہ کشمیر میں قادیانی فتنہ پھیلا ہوا ہے۔ اب تک وہاں پہنچ کر اس کے انسداد کے متعلق کوئی کام نہیں کیا گیا۔ اس سفر کا قصد کرنے کے ساتھ یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ کشمیر کے عوام اردو یا عربی کے رسائل تو پڑھ نہ سکیں گے۔ فارسی زبان میں مسئلہ ختم نبوت اور قادیانیت کے متعلق لکھ کر طبع کر کے وہاں ساتھ لے جائیں اور مفت تقسیم کریں۔ اس ارادہ کے ساتھ ہی خود ایک رسالہ کی تصنیف شروع فرما دی۔ ان یہ

تصنیف تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ مرض کے اشتداد نے بالکل ہی قویٰ کو معطل کر دیا تو ایک طالب
علم کے ذریعہ اس ناکارہ خلائق کے پاس پیغام بھیجا کہ میں نے کشمیری ضرورت سے
زبان میں مسئلہ ختم نبوت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا تھا مگر اب میں اس کی تکمیل
سے معذور ہوں تم سے ہو سکے تو اس کی تکمیل کردے۔

احقر ناکارہ نے تعمیل ارشاد کو سعادت عظمیٰ سمجھ کر شروع کرنے کا ارادہ ہی کیا
کہ حضرت استاذؒ کی حالت بدلنا شروع ہوئی اور یہ علم و تقویٰ کا آفتاب عالمتاب لب گور
کے کنارے آ لگا۔ یہاں تک کہ ۲ ماہ صفر ۱۳۵۲ھ شب دوشنبہ اس پیکر علم و تقویٰ مجسم و
دیانت نے دین ہی کی فکر میں اپنی عمر کا آخری سانس پورا کر دیا۔ آپ کے گرد و پیش
گویا بزبان حال یہ سنا جاتا تھا

اگرچہ خرمن عمرم غم تو داد بباد
بخاک پائے عزیزت کہ عہد نہ شکستم

اب وہ کشمیری قصہ اور وہاں رسالہ فارسی کی اشاعت بھی ایک خواب و خیال ہے
عرصہ کے بعد آپ کے مسودات میں سے وہ منتشر اوراق فارسی جمع کر کے مجلس علمی جا
اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت نے بنام خاتم النبیین شائع کیا اور یہی اوراق آپ کی آخری
تصانیف قرار پائے۔ (حیات انور ص ۲۵ تا ۲۶۹)

امام کشمیریؒ کا عربی قصیدہ:

حضرت کشمیریؒ نے رد قادیانیت کے سلسلہ میں اس اضطراب و بے چینی کا اظہار
اپنے بعض قصائد میں بھی کیا ہے۔ ایک طویل عربی قصیدہ میں جو "اکفار الملحدین"
میں طبع ہوا ہے آپ نے قادیانی فتنہ کی شدت و گمراہی کی طرف امت اسلامیہ کو متوجہ ف

اس قصیدہ کا زور بیان، قلق و اضطراب آج بھی امت اسلامیہ کا خون گرما دینے کی
صلاحیت رکھتا ہے۔

أَلَا يَا عِبَادَ اللهِ قُومُوا وَ قُومُوا — خُطُوبًا أَلَمَّتْ مَا لَهُنَّ يَدَانِ

اے اللہ کے بندو! اٹھو اور ان فتنوں کے کس بل نکال دو جو ہر جگہ چھا رہے
ہیں اور جن کے برداشت کرنے کی تاب و تاب نہیں رہی۔

وَقَدْ كَادَ يَنْقَضُّ الْهُدَى وَ مَنَارُهُ — وَزُخْرِجَ خَيْرٌ مَا لِذَاكَ تَدَانِ

ان فتنوں کی شدت سے ہدایت کے نشانات مٹنا چاہتے ہیں، خیر و صلاح سست رہی
اور پھر اس کے تدارک کی کوئی صورت نہیں پڑے گی۔

تُسَبُّ رَسُولٌ مِنْ أُولِي الْعَزْمِ فِيكُمْ — تَكَادُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ تَنْفَطِرَانِ

ایک اولوالعزم رسول (سیدنا عیسیٰ علیہ السلام) کو تمہارے سامنے گالیاں دی
جا رہی ہیں، قریب ہے کہ قہر الٰہی سے زمین اور آسمان پھٹ پڑیں۔

وَحَارَبَ قَوْمٌ رَبَّهُمْ وَ نَبِيَّهُ — فَقُومُوا بِنَصْرِ اللهِ إِذْ هُوَ دَانِ

ایک نابکار قوم (مرزائیوں) نے اپنے رب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے
جنگ چھیڑ رکھی ہے بس اللہ کی مدد کے بھروسے اٹھو کہ وہ بہت ہی قریب ہے۔

وَقَدْ جَلَّ صَبْرِي فِي انْتِهَاكِ حُدُودِهِ — فَهَلْ ثَمَّ دَاعٍ أَوْ مُجِيبٌ أَذَانِي

حدود اللہ کو ٹوٹتے دیکھ کر صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔ پس کیا
تمہاری دنیا میں کوئی حدود الٰہی کے تحفظ کے لئے پکارنے والا یا میری دعوت پر لبیک کہنے
والا ہے؟

إِذَا هَزَّ خَطْبٌ جِئْتُ مُسْتَنْصِرًا بِكُمْ — فَهَلْ ثَمَّ غَوْثٌ يَا لَقَوْمِ يُدَانِي

اور جب مصیبت حد برداشت سے نکل گئی تب میں نے مدد کے لئے تمہارے

دروازے پر دستک دی' پس اے قوم ! کیا کوئی فریادرس ہے جو آگے بڑھ کر میرے دکھ درد میں شریک ہو جائے؟

لعمری لقد نبهت من كان نائما ۔۔۔ واسمعت من كانت له اذنان

بخدا ! میں ان لوگوں کو جو خواب غفلت میں مست تھے' بیدار کر چکا ہوں اور ہر ایسے شخص کو جسے قدرت نے سننے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے سنا چکا ہوں۔

وناديت قوما في فريضة ربهم ۔۔۔ فهل من نصير لي من اهل زمان

اور میں قوم مسلم کو ان کے رب کے جانب سے عائد شدہ فریضہ کے سلسلہ میں پکار چکا ہوں' پس کیا اہل خانہ میں کوئی شخص میری مدد کو اٹھے گا؟

دعوا كل امر واستقيموا لما دهى ۔۔۔ وقد عاد فرض العين عند عيان

سب کچھ چھوڑ کر اس فتنہ عظمیٰ کے مقابلہ میں کمربستہ ہو جاؤ' اس لئے کہ اس فتنہ کا مشاہدہ ہو جانے کے بعد اس کا استیصال ہر شخص پر فرض عین ہو گیا ہے۔

الا فاستقيموا واستهيموا لدينكم ۔۔۔ فموت عليه اكبر الحيوان

ہاں اٹھو ! اور اپنے دین کی حفاظت کے لئے دیوانہ وار جان کی بازی لگا دو' بخدا ! دین کی خاطر جان دے دینا ہی سب سے اعلیٰ واشرف زندگی ہے۔

وعند دعاء الرب قوموا وشمروا ۔۔۔ حنانا عليكم فيه الف حنان

اور جب تحفظ دین کے لئے رب تعالیٰ کی طرف سے پکارا جا رہا ہے تو دیر کیوں کرتے ہو' اٹھو اور کمر ہمت چست باندھ لو اس راستے میں تم پر رحمتوں پر رحمتیں نازل ہوں گی۔ (ماہنامہ "الرشید" دارالعلوم دیوبند نمبر ص ۶۸۹، ۶۹۰)

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس میرا شعلہ بار ہوگا

تحفظ ختم نبوت کا کام نہ کر سکے تو گلی کا کتا بھی بہتر ہے :

قادیانیت کی بیخ کنی اور استیصال کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ نے مرض اور بڑھاپے کے باوجود سفر فرمایا۔ شاہ صاحبؒ اس سفر کو اپنے لئے ذخیرہ آخرت سمجھتے تھے۔ چنانچہ حسب روایت مولانا محمد انور لائل پوری جو اس سفر میں رفیق تھے، بہاولپور پہنچنے کے بعد جمعہ آپ نے بہاولپور کی جامع مسجد میں پڑھا اور نماز کے بعد ہزارہا مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :

میں بواسیر خونی کے مرض کے غلبہ سے نیم جان تھا اور ساتھ ہی اپنی ملازمت کے سلسلہ میں ڈابھیل کیلئے پابہ رکاب بھی، اچانک شیخ الجامعہ کا مکتوب مجھے ملا جس میں بہاولپور آکر مقدمہ میں شہادت دینے کیلئے لکھا گیا تھا، میں نے سوچا کہ میرے پاس کوئی زاد آخرت تو ہے نہیں، شاید یہی چیز ذریعہ نجات بن جائے کہ میں محمد ﷺ کے دین کا جانب دار بن کر یہاں آیا ہوں، پھر فرمایا، اگر ہم تحفظ ختم نبوت کا کام نہ کر سکیں تو گلی کا کتا بھی ہم سے بہتر ہے۔ (نقش دوام ص ۱۹۰)

فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کے لئے تلامذہ کو وصیت :

حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کے تلامذہ جب دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے اپنے علاقوں کا رخ کرتے تو تمام اساتذہ دارالعلوم دیوبند سے اور حضرت شاہ صاحبؒ سے الوداعی ملاقات کرتے دعا کراتے، آپ ہر طالب علم کو فتنہ قادیانیت کے استیصال کی طرف ضرور توجہ دلاتے اور بزبان حال فرماتے ....

قتیل اس شخص کا کیا واسطہ میرے قبیلے سے
وفا کے جرم میں جس نے سزا پائی نہیں ہوتی

فتنۂ قادیانیت کا مقابلہ کرو :

حضرت مولانا محمد علی جالندھری بھی حضرت شاہ صاحب کے شاگرد تھے۔ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت طلب کرتے ہوئے دعا کی درخواست کی اور عرض کیا کہ میرا خاندان اہل حدیث ہے، جبکہ میں حنفی ہوں۔ خطرہ ہے کہ گھر میں اختلاف مسائل سے بدمزگی پیدا نہ ہو۔ رفع اختلاف اور اصلاح ذات البین کے لئے خصوصی دعا فرمائیں۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا :

بھائی مولوی صاحب، اہل سنت اور اہل حدیث کے اختلاف کی کیا فکر ہے، تمہارے پنجاب میں جھوٹی نبوت، کذاب نبی، دجالِ اُمت اور خطرناک پارٹی پیدا ہو چکی ہے۔ یہ پارٹی کافرانہ عقائد اور غیر اسلامی مسائل کی حامل ہے۔ یہ لوگ اپنے عقائد کی بنیاد پر مرتد ہو چکے ہیں اور مسلمانوں کو مرتد بناتے ہیں مولوی صاحب اس فتنہ کا مقابلہ کرو اور مسلمانوں کے باہمی اختلافی مسائل سے بچتے رہو۔ قادیانی فتنہ اور طائفہ مرتدہ کے خلاف کام کر کے حضور علیہ السلام کی روح طیبہ کو خوش کرو۔ مسلمانوں اور اسلامی فرقوں کے مسائل میں اختلاف کے باوجود اتحادِ عمل اور آپس میں اتفاق رکھتے ہوئے منکرین جہاد و ختم نبوت کے مقابلہ پر سیسہ پلائی دیوار بن کر رہنا چاہئے مسلمان فرقوں کے درمیان اختلاف ہوتو ہو لیکن مخالفت نہ ہو اور سب مسلمانوں کو سب سے پہلے نبوت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ (ختم نبوت کے محاذ ص ۱۸)

آخری وصیت :

میں نے خود حضرت شاہ صاحبؒ سے سنا کہ :

''جب یہ فتنہ کھڑا ہوا تو چھ ماہ تک مجھے نیند نہیں آئی اور یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں دین محمدی (علی صاحب الصلوۃ والسلام) کے زوال کا باعث یہ فتنہ نہ بن جائے۔ فرمایا چھ ماہ کے بعد دل مطمئن ہو گیا کہ ان شاء اللہ دین باقی رہے گا اور یہ فتنہ مضمحل ہو جائے گا''۔

میں نے اپنی زندگی میں کسی بزرگ اور عالم کو اس فتنہ پر اتنا دردمند نہیں دیکھا جتنا کہ امام العصر حضرت شاہ صاحبؒ کو۔

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل میں ایک زخم ہو گیا ہے جس سے ہر وقت خون ٹپکتا رہتا ہے۔ جب مرزا کا نام لیتے تو فرمایا کرتے تھے ''لعین ابن اللعین قادیان'' اور آواز میں ایک عجیب درد کی کیفیت محسوس ہوتی۔ فرماتے تھے کہ :

''لوگ کہیں گے کہ یہ گالیاں دیتا ہے فرمایا کہ ہم اپنی نسل کے سامنے اپنے اندرونی دردِ دل کا اظہار کیسے کریں ہم اس طرح قلبی نفرت اور غیظ و غضب کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں، ورنہ محض تردید و تنقید سے لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ تو علمی اختلافات ہیں جو پہلے سے چلے آتے ہیں''۔

مرض موت میں جب تمام قوتیں جواب دے چکی تھیں اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے' ایک دن (یہ جمعہ کا دن تھا) جامع مسجد میں ڈولی میں لائے گئے اور اپنے شاگردوں اور علماء اور اہلِ دیوبند کو آخری وصیت فرمائی کہ دین اسلام کی حفاظت کی خاطر اس فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کے لئے پوری کوشش کریں اور فرمایا :

''میرے تلامذہ کی تعداد جنہوں نے مجھ سے حدیث پڑھی ہے دو ہزار ہوگی' ان سب کو میں وصیت کرتا ہوں کہ اس فتنہ کے خلاف پوری جدوجہد کریں''۔

(خاتم النبیین ﷺ ص ۲۳۳ از مولانا انور شاہ کشمیری)

میں جنت کا ضامن ہوں :

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دنیا کو الوداع کہنے والے تھے۔ اس کا بھی ایک واقعہ روایت حضرت علامہ شمس الحق صاحب افغانی سن لیں۔ حضرت علامہ افغانیؒ بھی حضرت علامہ کشمیریؒ کے اجل شاگردوں میں سے تھے۔ حضرت علامہ افغانیؒ نے فرمایا کہ :

"جب حضرت کشمیریؒ کا آخری وقت آیا، کمزوری بہت زیادہ تھی، چلنے کی طاقت بالکل نہ تھی، فرمایا کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کی مسجد پہنچا ئیں۔ اس وقت کاروں کا زمانہ نہ تھا، ایک پالکی لائی گئی، پالکی میں بٹھا کر حضرت شاہ صاحب کو دارالعلوم کی مسجد میں پہنچایا گیا۔ محراب میں حضرت کی جگہ ڈالی گئی تھی، وہاں بٹھا دیا گیا، حضرت کی آواز ضعف کی وجہ سے انتہائی نحیف اور دھیمی تھی۔ تمام اجل شاگرد حضرتؒ کے ارد گرد ہمہ تن گوش بنے بیٹھے تھے۔ آپ نے صرف دو باتیں فرمائیں۔ پہلی بات تو یہ فرمائی کہ تاریخ اسلام کا میں نے جس قدر مطالعہ کیا ہے، اسلام میں چودہ سو سال کے اندر جس قدر فتنے پیدا ہوئے ہیں، قادیانی فتنہ سے بڑا خطرناک اور سنگین فتنہ کوئی بھی پیدا نہیں ہوا۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ حضور ﷺ کو جتنی خوشی اس شخص سے ہوگی جو قادیانیت کے استیصال کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے تو رسول اکرم ﷺ اس کے دوسرے اعمال کی نسبت اس کے اس عمل سے زیادہ خوش ہوں گے اور پھر آخر میں جوش میں آکر فرمایا کہ جو کوئی اس فتنہ کی سرکوبی

کے لئے اپنے آپ کو لگا دے گا اس کی جنت کا ضامن میں ہوں"۔

(انتہی) سبحان اللہ! دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں، آخری وقت ہے، اگر فکر ہے تو اس فتنہ کی۔

(چراغ ہدایت ص ۲۳۳ تا ۲۳۴ از مولانا محمد چراغ تقریر مولانا منظور احمد چنیوٹی)

محمدؐ کی محبت دین حق کی شرط اول ہے
اس میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے
محمدؐ کی محبت آن ملت، شان ملت ہے
محمدؐ کی محبت روح ملت جان ملت ہے
محمدؐ کی محبت خون کے رشتوں سے بالا ہے
یہ رشتہ دنیوی قانون کے رشتوں سے بالا ہے
محمدؐ ہے متاع عالم ایجاد سے پیارا
پدر، مادر، برادر، مال، جان اولاد سے پیارا

امام کشمیریؒ نے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت کا اعزاز بخشا :

حیات امیر شریعت کے مؤلف مرزا جانباز لکھتے ہیں :

پیشتر ازیں تحریر کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی ابتری نے ملک کا امن و سکون تہہ و بالا کر دیا تھا اور یہ خانہ ویرانی اسلام کی ترقی کی راہ میں سنگ گراں تھی۔ ہندو کے طرز عمل نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے لئے شہادت کی موت تلاش کریں تاکہ ہندوستان میں نبی کریم ﷺ کی آبرو محفوظ رہ سکے۔ شدھی و سنگٹھن شاردا ایکٹ تحریک شاتم رسول کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے کمزور اور قلیل تعداد مسلمانوں کو اس قدر ہراساں کر دیا تھا کہ علمائے کرام کی اپنی ذمہ داریاں بھی مخدوش نظر آنے لگی تھیں۔ خطیب شہری

اذان بے اثر ہو رہی تھی، صحن حرم اور مسجد کے مینار اپنی رونق کی تلاش میں سرگرداں تھے کہ مارچ ۱۹۳۰ء کے آخری دنوں میں لاہور میں انجمن خدام الدین کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے فرمائی۔ وقت اور حالات کی موجودگی میں علمائے ہندوستان کا تاریخی اجتماع تھا۔ دوسرے علماء کے ساتھ شاہ جی (حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری) بھی اس جلسے میں شریک ہوئے ہزاروں کا اجتماع تھا۔ صدارتی تقریر ہو رہی تھی کہ شاہ جی جلسہ گاہ میں پہنچے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرما رہے تھے :

''دین کی قدریں بگڑ رہی ہیں۔ کفر چاروں طرف سے یلغار کر چکا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنے لئے ایک امیر کا انتخاب کرنا چاہئے۔ اس کے لئے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو منتخب کرتا ہوں، وہ نیک بھی ہیں اور بہادر بھی۔ اس وقت انہوں نے فتنہ شاتم رسول اور شاردا ایکٹ کے سلسلے میں جس جرأت اور دلیری سے دین کی خدمات انجام دی ہیں۔ آئندہ بھی ان سے ایسی ہی توقع ہے''۔

یہ کہہ کر حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے دونوں ہاتھ حضرت شاہ جیؒ کی طرف بڑھائے اور شاہ جیؒ نے اپنے دونوں ہاتھ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہاتھوں میں دے کر فرمایا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے بلکہ حضرت نے مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمایا ہے۔ (حیات امیر شریعت ص ۱۳۴)

یہ جملے کہہ کر شاہ جی زار و قطار رونے لگے اور ان کا سارا جسم کانپنے لگا۔ اس کے بعد باقی علماء جن کی تعداد پانچ صد تھی، اس وقت شاہ جی (امیر شریعت) کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان میں مولانا ظفر علی خان، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا احمد علی لاہوری

سرفہرست تھے۔

حصولِ زندگی میں مذہب ایسے جذبات کا مجموعہ ہے جس سے عقل انسانی احاطہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی فکر و تدبر میں ان کا وزن کیا جا سکتا ہے۔ جنونِ شوق ہی البتہ اس کسک کو محسوس کرتا ہے، پھر نمرود کی آگ ہو یا دریائے نیل کی موجیں وہ ان تمام خطرات کی دعوت پر لبیک کہتا ہے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک فرنگی عملداری میں کفر و ارتداد نے اصولِ اسلام، داعیِ اسلام اور مسلمانوں پر وقت کے مختلف موڑوں سے جس طرح بے محابا خشت باری کی، حضرت امیر شریعت سینہ سپر ہو کر ان سے ٹکرائے اور بامراد ہوئے۔ حضرت انور شاہ کشمیری صاحبؒ اور دیگر پانچ صد مقتدر علماء کا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت کا اعزاز بخشنا انہی خدمات کا صلہ تھا اور ہنوز مستقبل کی کئی اُمیدیں ان سے وابستہ تھیں۔

قائد شریعت :

وقت گذرتا رہا اور تاریخ نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو دہرایا ایک وقت وہ بھی آیا جب چشمِ فلک نے دیکھا کہ ہزارہ ڈویژن کے تین ہزار علماء نے تحریک نفاذ شریعت کیلئے محدث کبیر شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ کو قائد شریعت کا خطاب دیا یوں حضرت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت کا لقب ملا تو استاذِ مکرم حضرت مولانا عبدالحقؒ کو قائد شریعت کا اعزاز حاصل ہوا۔

امیر شریعتؒ سے محبت اور تعلق پر افتخار :

امیر شریعت تحفظ ختم نبوت کے جانباز سپاہی اور قائد تھے۔ تحفظ ختم نبوت ان کی زندگی کا مشن تھا، اس لئے حضرت علامہ انور شاہؒ صاحب کو امیر شریعت سے خصوصی تعلق اور محبت تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا محمد ازہر شاہ قیصر بیان کرتے ہیں۔

اباجیؒ شاہ جیؒ کے سو جان سے دیوانے تھے۔ ہر وقت شاہ جیؒ کا کلمہ پڑھتے ہر وقت انہی کا حال پوچھتے۔ کتاب سے فراغت ہوئی، چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سادہ چائے آئی اس کا دور چلا۔ سامنے میرے ماموں جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب یا مولانا حفظ الرحمان، مولانا محمد ادریس صاحب، مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی ہوئے اور اباجیؒ نے سلسلہ کلام شروع کر دیا۔ کیوں مولوی صاحب؟ ہم عطاء اللہ شاہ کو اگر سب کاموں سے ہٹا کر صرف تردید قادیانیت پر لگا دیں تو یہ کیسا رہے گا؟

مولوی صاحب ! یہ صاحب واقعی مخلص ہیں بہت محنتی اور بہت زیادہ بہادر۔ انہوں نے پنجاب میں چند تقریریں کر کے قادیانیت کے خلاف ایک عام جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اس طرح محنت سے کام کیا تو قادیانیت انشاء اللہ ختم ہو جائے گی۔ قادیانیت کے سلسلہ میں شاہ جیؒ نے جتنا کام کیا، سب اباجیؒ کے اشارہ و ارشاد پر۔ شاہ جیؒ کی تقریریں پسند کی جاتیں تو اباجیؒ کا خون سیروں بڑھ جاتا۔ وہ تردید قادیانیت کے لئے لمبے لمبے دورے کرتے تو اباجیؒ کی نگاہ ان کے ہر قدم پر رہتی۔ ایک دفعہ جمعہ کے خطبہ میں فرمایا:

"پنجاب میں ایک صاحب ہمیں مل گئے ہیں۔ صاحب توفیق، صاحب صلاحیت، صاحب سواد خوب کام کرتے ہیں۔ ہم نے قادیانیت کے متعلق انہیں توجہ دلائی ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے جو کام نہ ہوا وہ اس نوجوان (حضرت شاہ جیؒ) نے کر دکھایا ہے"۔

حضرت امام کشمیریؒ عقیدہ ختم نبوت کو دین کی اساس و بنیاد سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کے تحفظ کے سلسلہ کو حرز جان کی طرح اولین اہمیت دیتے تھے۔ اخلاص و للّٰہیت ان کا مزاج تھا جو کچھ کرتے تھے، رضائے الٰہی کے لئے کرتے تھے۔

علامہ اقبالؒ سے تعلق و دوستی :

علامہ محمد اقبالؒ سے حضرت شاہ صاحبؒ کے گہرے مراسم تھے۔ ان گہرے مراسم اور دوستی کا یہ نتیجہ نکلا کہ علامہ محمد اقبال قادیانیت کے فتنۂ عظیم کے مفاسد و مکائد سے مطلع اور ان کی بیخ کنی کے لئے عملاً آمادہ ہو گئے۔ چونکہ حضرت صاحبؒ فتنہ قادیانیت کی تردید و ابطال کو اپنی زندگی کا مشن اور عظیم مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ڈاکٹر اقبال کو بھی اس رنگ میں رنگا۔ پھر اقبال مرحوم نے اپنی تحریر و تقریر اور شاعری میں اس فتنہ کی برائیوں کو ہر جگہ بے نقاب کیا۔ یہ علامہ محمد انور شاہؒ کا فیض نظر تھا جو ختم نبوت کے سلسلہ میں علامہ اقبال کو یہ افکار عمیق، لذت گفتار اور انداز بیان کی چبھن نصیب ہوئی۔

انور شاہؒ کی مثال بہ ارشاد علامہ اقبالؒ :

ڈاکٹر اقبال مرحوم کو حضرت شاہ صاحبؒ سے اس قدر شغف اور تعلق ہو گیا تھا کہ حضرت سے ملاقات کا ہر وقت اشتیاق لگا رہتا تھا۔ مقدمہ بہاولپور کے سفر میں جبکہ احقر بھی ہمراہ تھا لاہور ورود ہوا۔ آسٹریلیا بلڈنگ میں قیام فرمایا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کو جب میزبان کی طرف سے اطلاع پہنچی، فوراً کار سے تشریف لائے۔ کئی گھنٹے مختلف مسائل میں حضرتؒ سے استفادہ فرماتے رہے۔ اکثر رقت طاری ہو جاتی تھی، پھر وصال سے چند ایام قبل جب لاہور تشریف لے گئے، ڈاکٹر اقبال مرحوم نے خود قیام کا انتظام کرایا۔ اپنے احباب سمیت ہر وقت حاضر خدمت رہتے تھے۔ حضرت امام کشمیریؒ کی مجالس میں اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کو حاضر ہونے کی دعوت دیتے، پھر برکت علی محمڈن ہال میں اپنے اہتمام سے جلسہ کا انعقاد کیا۔ ختم نبوت اور ردّ قادیانیت پر حضرتؒ کا بیان ہوا۔ ڈاکٹر صاحبؒ پر اس قدر اثر ہوا کہ ردّ قادیانیت کے لئے کمربستہ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کا آخری دور کا کلام نظم و نثر اردو و فارسی ان حقائق کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ردّ قادیانیت میں نہایت بلند پایہ مضامین سپرد قلم فرمائے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب قادیانی نے ملازمین برطرف کرائے۔ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی کھلی کرامت ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اس کی سعی فرماتے رہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو لاہور لایا جائے۔ فرمایا کرتے تھے، دیوبند میں بعض جزوی اختلافات کے رونما ہونے کو ہم اپنے لئے نیک فال سمجھتے ہیں۔ یہ تو احقر کے سامنے لاہور میں حضرت سے عرض کرتے تھے کہ میں نے اپنی ذاتی سعی سے احباب کو کوئی ہزار کی رقم جمع کرنے کے لئے کہا ہے کہ جناب کے لئے ایک کوٹھی تعمیر کرائی جائے اور کتب مہیا کی جائیں تاکہ آپ کی ذات سے قدیم و جدید تعلیم یافتہ حضرات استفادہ کریں اور مسائل جدیدہ جس قدر سامنے آ رہے ہیں، ان کے حل کی کوشش کی جائے اور علم الفقہ کی از سرِ نو ترتیب دی جائے۔

حضرت شاہ صاحب مرحوم لاہور کے آخری سفر میں رسالہ خاتم النبیین کا مسودہ ساتھ لے گئے تھے۔ اس کے بعض مقامات ایک مجلس میں سنائے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نہایت محظوظ ہوئے، اپنے دوستوں کو بلا بلا کر لاتے اور بار بار سنانے کا تقاضا کرتے۔

حضرت کے وصال کی خبر لاہور میں سن کر ڈاکٹر صاحبؒ بے حد مغموم ہوئے۔ تعزیتی جلسہ اپنے اہتمام سے کرایا۔ خود صدارتی تقریر میں بھرائی ہوئی آواز میں جو الفاظ ادا فرمائے، فضا میں اب تک گونج رہے ہیں۔ فرمایا:

''مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کی مثال پیش کرنے سے اسلام کی پانچ سو سال کی تاریخ عاجز ہے''۔ (اقبال کے ممدوح علماء ص [illegible] از قاضی افضل حق قرشی)

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قادیانی نبوت برگِ حشیش:

ضربِ کلیم میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں

میں نہ عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام
عصر حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفت ماہ تمام
وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

علامہ انور کشمیریؒ اور علامہ اقبالؒ:

اس زمانے میں پنجاب اور دیگر برصغیر میں انگریزی تعلیم یافتہ طبقے میں قادیانی فتنے کی شر انگیزی اور اسلام کشی کا جو احساس پایا جاتا تھا، اس میں بڑا دخل ڈاکٹر اقبالؒ کے اس لیکچر کا تھا جو عقیدۂ ختم نبوت پر تھا اور ساتھ ہی اقبالؒ کے اس انگریزی مقالہ کا بھی بڑا اثر تھا، جو قادیانیت کے خلاف شائع ہوا تھا، لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان دونوں تحریروں کا اصل باعث مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ ہی تھے۔

ایک مرتبہ انجمن خدام الدین کے سالانہ اجتماع میں شرکت کے لئے علامہ انور شاہ لاہور تشریف لائے تو ڈاکٹر اقبال ان سے ملاقات کے لئے خود ان کی قیام گاہ پر پہنچے پھر ایک شب انہیں اپنے ہاں کھانے پر بھی مدعو کیا۔ دعوت کا تو بہانہ ہی تھا۔ علامہ اقبالؒ کے

پیش نظر اصل مقصد تو علامہ انور شاہؒ سے علمی استفادہ کرنا تھا۔ چنانچہ رات کے کھانے کے بعد ڈاکٹر اقبالؒ نے عقیدۂ ختم نبوت اور قتل مرتد کا مسئلہ چھیڑ دیا، جس میں اڑھائی گھنٹے تک گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر اقبالؒ کی عادت یہ تھی کہ جب وہ کسی اسلامی مسئلے پر کسی بڑے عالم سے گفتگو کرتے تھے تو بالکل ایک طالب علم کا انداز اختیار کر لیتے تھے۔ ہر زیر بحث مسئلے کے ایک ایک پہلو کو سامنے لاتے اور اس کے بارے میں اپنے شکوک وشبہات کو بے تکلفانہ بیان کرتے چلے جاتے تھے۔

چنانچہ علامہ انور شاہؒ کے ساتھ گفتگو میں بھی انہوں نے یہی انداز اختیار کیا۔

حضرت انور شاہ کشمیریؒ نے ان کے تمام شکوک وشبہات اور اعتراضات کو بڑے صبر وسکون کے ساتھ سنا اور اس کے جواب میں ایسی جامع اور مدلل تقریر کی کہ ان دونوں مسائل کے بارے میں ڈاکٹر اقبالؒ کو مکمل طور پر اطمینان ہو گیا اور ان مسائل کے بارے میں اگر کوئی خلش ان کے دل ودماغ میں تھی تو وہ جاتی رہی۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے عقیدۂ ختم نبوت کے بارے میں وہ لیکچر تیار کیا جو ان کے چھ لیکچرز کے مجموعے میں شامل ہے۔ انہوں نے قادیانیت پر وہ حقیقت افروز مقالہ سپرد قلم کیا کہ جس نے انگریزی اخبارات میں شائع ہو کر پنجاب کی فضا میں تلاطم برپا کر دیا۔ (روزنامہ پاکستان، ۲۱ر ستمبر ۲۰۰۰ء از چوہدری اصغر علی کوثر وڑائچ)

چشم نرگس سے کوئی حال چمن کا پوچھے
دیکھتے دیکھتے کیا کیا گل خنداں نہ رہے

اقبالؒ کو امام کشمیریؒ کا تحفہ:

حکیم الامت حضرت اقبالؒ اگرچہ فلسفے پر خود پورا عبور رکھتے تھے اور اسی مضمون میں انہوں نے ایم اے بھی کیا تھا۔ پھر اسلامیات کا بھی وسیع مطالعہ رکھتے تھے، جس کا

اندازہ ان کی شاعری، خطبات اور دیگر تصانیف سے بھی ہوتا ہے لیکن بایں ہمہ انہوں نے **Reconstruction of Religious Thoughts** کے عنوان سے انگریزی زبان میں جو 6 لیکچرز تیار کیے، ان میں علامہ کشمیریؒ سے خاطر خواہ مدد لی۔

''حدوث عالم'' پر علامہ انور شاہ کا منظوم رسالہ اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالہ ''حدوث عالم'' کے موضوع پر قدیم وجدید فلسفہ اور اس پر جامع تنقید کا نچوڑ ہے۔ یہ رسالہ جب چھپا تو علامہ انور شاہ نے اس کا ایک نسخہ بدست مولانا سعید احمد اکبرآبادی تحفۃً ڈاکٹر اقبالؒ کو بھی ارسال فرمایا۔

چنانچہ علامہ اقبالؒ نے پڑھنے کے بعد مولانا سعید احمد اکبرآبادی سے کہا میں مولانا انور شاہ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ وقال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک وبصیرت ہے اور اس کے مسائل پر وہ اس قدر گہری نگاہ رکھتے ہیں کہ حدوث عالم پر اس رسالے میں انہوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس کی توقع تو یورپ کے بڑے سے بڑے فلسفی سے بھی نہیں کی جا سکتی۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی ان دنوں بطور طالب علم لاہور میں مقیم تھے اور علامہ اقبالؒ کو اس کا علم تھا۔ علامہ اقبالؒ یہ بھی جانتے تھے کہ علامہ انور شاہؒ سے بھی مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی گہری ارادت تھی، اس لئے انہوں نے چار شعروں پر نشان لگا کر یہ رسالہ ان کے سپرد کیا کہ جب بھی آپ کی ملاقات علامہ انور شاہ سے ہو تو ان سے کہیے گا کہ ان چار اشعار کا مفہوم مجھے سمجھ نہیں آیا۔ آپ بتا دیجئے کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ مگر علامہ انور شاہؒ نے رسالہ لے کر مولانا سعید احمد کو کہنے کے بجائے ان اشعار کے مفہوم کے بارے میں ڈاکٹر اقبالؒ کو فارسی میں ایک طویل خط لکھا۔ یہ خط مولانا سعید احمد ہی لے کر آئے اور ڈاکٹر اقبالؒ کو دیا۔ (روزنامہ پاکستان، ۲۱ر ستمبر ۲۰۰۰ء، از قلم چوہدری اصغر علی کوثر وڑائچ)

اے دل ! تمام نفع ہے سودائے عشق میں :

حضرت شاہ صاحبؒ کی پوری سوانح پڑھ جایئے، ختم نبوت کے حوالے سے اُن کے معرکوں کی گونج تاریخ کے صفحات میں سُنی جائے گی۔ تردید قادیانیت کے سلسلہ میں اُن کے مجاہدانہ کردار کے قصے لوگوں کی زبان پر رہیں گے۔ اُن کے عشق رسول کی داستان ضرب الامثال بنے گی۔ عشق رسول ہی وہ مقام ہے جہاں عقل کے پر جلتے ہیں، بڑے بڑے وفادار رفیق پیچھے رہ جاتے ہیں، لیکن شاہ صاحب جیسے لوگ اپنے کام کئے جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے نظر آتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب : ۱۰

حضرت امام کشمیریؒ کا سفرِ آخرت

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

محمد عربی ﷺ کا ارشاد ہے، دل بھی اس طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح پانی لگ جانے سے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس زنگ کو دور کس طرح کیا جائے۔ آپ نے فرمایا۔ موت کو یاد رکھیں اور قرآن مجید کی کثرت سے تلاوت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ موت کو ہر وقت یاد رکھتے ہیں اور بعض تو اشتیاق سے اس کے منتظر رہتے ہیں

خرم آن روز کہ زیں منزل ویراں بردم
راحت جان طلبم و زپئے جانان بردم

رب ذوالجلال کے نیک بندوں نے اس عارضی زندگی کو ایک آزمائش ایک امتحان اور دیدار الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھا اور وصال دوست اور دیدار دوست کی آرزو میں تڑپنا اپنا معمول بنایا۔ موت اُن کے لئے اذیت نہ تھی بلکہ ملاقات دوست کا پیغام اور مژدہ سنانے کا باعث تھی۔ اس لئے وہ موت کی طلب میں بے قرار رہتے تھے، جنگ یرموک کے دوران سب سے پہلے ایک مجاہد سپہ سالار فوج کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کیا

اے بوعبیدہ! رخصت پیکار دے مجھے
لبریز ہوگیا میرے صبر و سکوں کا جام
بے تاب ہوگیا ہوں فراق رسول ﷺ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام

موت کا ایسا اشتیاق بارگاہ رب ذوالجلال میں باریابی کا ایسا یقین اور رحمت خداوندی کی ایسی طلب ہی ایمان کی علامت اور نشانی ہے۔ اللہ کے محبوب بندوں نے اس عارضی زندگی اور رنگ و بو کی فانی بستی میں کبھی دل نہیں لگایا اور سفر آخرت پر روانگی سے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے ہیں

دیکھ لینے کو تیرے سانس لگا رکھا ہے
ورنہ بیمار غم ہجر میں کیا رکھا ہے

ہمیں موت کیوں کڑوی لگتی ہے۔ ہمارے مزاج میں خرابی کیوں آ گئی ہے۔ درحقیقت ہم دنیا سے دل لگا بیٹھے ہیں، موت وحیات کے بارے میں ہمارا تصور غلط ہے۔ ہمیں ہمارے محبوب ﷺ نے تو چودہ سو سال قبل بتلا دیا ہے کہ ہم دنیا میں مسافر ہیں اور مسافر بھی ایسے جو گھڑی دو گھڑی کیلئے کسی سایہ دار درخت کے نیچے آرام کرے اور پھر اپنی منزل کو روانہ ہو جائے۔ حضرت امام کشمیریؒ کا جب وقت آخر آیا تو گریہ وخشیت الٰہی کے آثار آپ پر نمایاں تھے، جو ساتھی ملتا اس سے فرماتے بھائی ہماری آپ سے آخری ملاقات ہے۔ اکثر گھر میں فرماتے، پیر کے روز مجھے سفر کرنا ہے، کس جگہ جانا ہے، اس کا تعین نہ فرماتے۔

حضرت امام کشمیریؒ کی علالت :

حضرت امام کشمیریؒ کے فرزند جناب مولانا انظر شاہ کشمیری حضرتؒ کی بیماری اور سفر آخرت کے لمحات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

ڈابھیل کے زمانہ قیام میں پرانے مرض ''بواسیر خونی'' کا غلبہ ہوا۔ اس میں بڑا دخل گجرات کی آب و ہوا کی ناموافقت کو تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ مرض آہستہ آہستہ بڑھتا

گیا۔ قویٰ پر ضعف غالب آ گیا، بھوک ختم ہو گئی۔ بیماری کی شدت ہوئی تو آپ ڈابھیل سے رخصت لے کر دیوبند تشریف لے آئے۔ مکان پر علاج و معالجہ جاری رہا۔ دہلی کے مشہور معالج حکیم نابینا صاحب، حکیم محمد احمد صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب علاج کرتے رہے۔ خود آپ کے برادر نسبتی حکیم سید محفوظ علی صاحب تجربہ کار طبیب تھے۔ تن دہی سے تدابیر صحت کر رہے تھے، لیکن مرض کا یہ عالم تھا کہ بڑی مقدار میں خون اجابت کے ساتھ خارج ہوتا۔

شفیق باپ کی شفقت کا آخری مظاہرہ :

۲ صفر ۱۳۵۲ھ بروز اتوار عصر سے کچھ پہلے قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے۔ خون بڑی مقدار میں جسم سے خارج ہو گیا۔ عصر کے بعد دارالعلوم دیوبند کا ایک ہجوم مزاج پرسی کے لئے آیا۔ میری عمر اس وقت چار یا ساڑھے چار سال کی تھی۔ اتفاقاً اس دن آماس گلو کا مرض لاحق تھا۔ خوب یاد ہے۔ والدہ مرحومہ نے اشارہ فرمایا کہ والد کی خدمت میں پہنچ کر دم کرا لوں۔ خدا تعالیٰ نے آپ کے دم میں خاص تاثیر عنایت کی تھی۔ چنانچہ دم کرایا گیا، شفا نصیب ہوئی۔ ایک یتیم ہونے والے بچے کے لئے شفیق باپ کی شفقت کا یہ آخری مظاہرہ تھا۔ مغرب کی اذان پر مہتمم صاحب اور طلبا قریب ہی مسجد میں نماز مغرب ادا کرنے کے لئے گئے۔ آپ نے چارپائی پر مغرب کی نماز ادا فرمائی۔

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود :

عصر و مغرب کے درمیان بیماری کی شدت بڑھتی رہی، بلکہ مغرب کے بعد سے نزع کی کیفیات طاری ہو گئیں، لیکن ہوش وحواس کی سلامتی اور مکمل حفظ و بیداری کی وجہ سے آنے جانے والوں اور گھر کے کسی فرد بلکہ تجربہ کار، حاذق طبیب کو بھی اس کیفیت پر

نزع کا شبہ نہیں ہوا۔ چوں قضا آید طبیب ابلہ شود۔ وقت گزرنے کے ساتھ آپؒ کی بے چینی بڑھتی جاتی۔ تشنگی کا یہ عالم تھا کہ چند سیکنڈ کے وقفہ سے پانی کی ضرورت محسوس ہوتی، ایک قریبی عزیز محمد سعید مرحوم خدمت کی آخری سعادت سے بہرہ اندوز تھے۔ آپ بڑی بے تابی کے ساتھ اُٹھتے: ''بھائی سعید! پانی پلاؤ'' کے مضطربانہ کلمہ سے پانی طلب فرماتے۔ چند گھونٹ پی لیتے اور اسی پانی میں انگلیاں تر فرما کر کبھی چہرہ اور کبھی سینہ پر ملتے۔ حسب معمول حسبنا اللہ پڑھتے ہوئے سیدھے لیٹ جاتے، بے تابی سے اُٹھنا، بے قراری سے لیٹ جانا مسلسل ہوتا۔

علم وکمال کا آفتاب غروب ہوا چاہتا تھا:

یہ رات اپنے منظر کے حساب سے بڑی بھیانک تھی۔ شام سے ہی والدہ کے سر میں شدید درد تھا۔ دنیا ومافیہا سے بے خبر گھر کے ایک گوشے میں لیٹی ہوئی تھی۔ معصوم بچے محو خواب اور بڑوں کے دماغ پر نیند کا خمار۔ کسی کو جگایا بھی جاتا تو بیداری وخواب کی کشمکش میں نیند کی فتح ہوتی۔ آخری چند گھڑیاں خالہ زاد بھائی محمد سعید اور ان کی والدہ کے ساتھ ہی گزریں۔ رات کی تاریکی بڑھتی جاتی۔ زندگی کے مشرق پر علم وکمال کا آفتاب جہاں تاب جو نصف صدی سے مصروف گردش تھا جس کی روشنی سے علمی کائنات کے ذرے چمک رہے تھے اور جس کی گرمی سے روح گرمی حیات پائے ہوئے تھی بڑھ کر موت کے مغرب میں چھپا چاہتا تھا۔ ایک تاریکی رات اپنے ساتھ لائی تھی، ایک اندھیرا اس دنیا میں اور پھیلنا چاہتا تھا، جس کے لئے ایک مردحق آگاہ کی زندگی اس ناسوتی عالم سے بسرعت اپنا تعلق توڑ رہی تھی۔ شب کے گیارہ بجے پندرہ منٹ اور بڑھے اس پر آدھ گھنٹہ کا اضافہ ہوا، ادھر امیر المؤمنین فی الحدیث موت کے پیہم حملوں سے لاچار ہو کر مصفی وپاکیزہ روح کو قفس

عنصری سے آزاد کر رہا تھا۔

سفید پوشوں کا ہجوم:

میری خالہ کا بیان ہے جن کی زندگی کے ساتھ اسی سال کی طویل صداقت بیانی ایک شاہد عدل کی حیثیت رکھتی ہے کہ میں نے گھر میں جلتے ہوئے چراغ کو پست کیا تو گھر کا پورا صحن سفید پوش انسانوں سے جن کے سروں پر عربی عمامے تھے لبریز ہو گیا۔ کبھی اپنی آنکھوں پر شبہ ہوتا اور کبھی اس منظر پر حیرت ہوتی، کیا یہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ ہیں؟ لیکن آج تو ان کو اندر آنے کی اجازت نہیں، کیا یہ بلند پایہ علماء کا گروہ ہے؟ جنہیں ان کی خصوصیات کی بنا پر اندر آنے کی اجازت مل گئی، لیکن ان کے منور چہرے، عربی طور وطریق میرے تمام تخیلات کو غلط کر دیتے۔ اس خدا کی قسم! جس کے قبضہ میں تمام انسانوں کی جان ہے، نہ میری آنکھیں دیکھنے میں غلطی کر رہی تھیں اور نہ صورت واقعہ کے بیان میں کسی مبالغہ سے کام لیا۔ دیوار پر آویزاں گھنٹے نے اپنی مانوس آواز میں بارہ بجائے۔ حضرت شاہ صاحبؒ ایک ناقابل گفتنی اضطراب کے ساتھ پلنگ پر اٹھ بیٹھے۔ ''بھائی مجھے پانی پلا دو'' کانپتے ہاتھوں سے ایک گلاس کو ہونٹوں تک پہنچایا ابتداء میں حسبنا اللہ اور خاتمہ کلمہ توحید کے پاکیزہ ورد پر کیا۔ خود ہی چارپائی پر قبلہ رخ ہو گئے، وہ مقدس ہجوم جس نے گھر کے ماحول کو لبریز کر رکھا تھا کوئی چیز ہاتھوں میں تھام کر بلند آواز سے کلمہ طیبہ کا ورد کرتا ہوا گھر سے باہر جا رہا ہے۔

کائنات علم کا عظیم سانحہ:

میں نے جھک کر دیکھا تو پیشانی پسینہ آلود تھی اور شاہ صاحب مرحوم ساکت وصامت لیٹے ہوئے تھے۔ دنیا میں اندھیرا چھا گیا روشنی گل ہو گئی، علم وکمال کا آفتاب غروب

ہوگیا اور رشد و ہدایت کا چراغ بجھ گیا۔ یہ دو صفر ۱۳۵۲ھ اتوار کا دن ختم ہو کر تین صفر شب پیر تھی۔ تقریباً نصف شب کے وقت کائنات علم کا یہ سانحہ عظیم پیش آیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

امام الحدیث کی وفات ہوگئی :

اس سانحہ کی اطلاع فوراً دیو بند میں پھیل گئی۔ دارالعلوم دیو بند جہاں طلبہ گرمی کی رات میں اپنے کمروں سے باہر مصروف خواب تھے۔ نودرہ کی مشہور عمارت کے سامنے ایک بھیانک پُر درد آواز سُنی گئی۔ لوگو تم سو رہے ہو امام الحدیث کی وفات ہوگئی۔ آواز کچھ ایسی زہرہ گداز تھی کہ سونے والے جاگ گئے اور سہمے کے سہمے رہ گئے۔ قاری اصغر علی صاحب حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خصوصی خادم بیان کرتے ہیں کہ اس آواز سے چند منٹ پہلے میں حضرت مدنیؒ کے سر میں مالش سے فارغ ہوا تھا۔ وہ زنان خانے میں تشریف لے گئے۔ ادھر میں اپنے بستر پر دراز ہوا کہ یہ فلک شگاف نعرہ کانوں میں گونجا، میں گھبرا کر اٹھا دیکھا کہ اندر سے مولانا مدنیؒ برہنہ پا و برہنہ سر باہر تشریف لے آئے۔ مجھ پر خوف کا ایسا غلبہ تھا کہ بے اختیار مولانا کی پناہ گاہ میں آ گیا۔ کہتے تھے کہ یہ جنات تھے جو حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر ماتم کناں ہیں۔ کچھ طلبا نے اس جسم کو دیکھا، جس سے یہ خوفناک آواز نکل رہی تھی۔ اس آواز کو سن کر طلبہ شاہ صاحبؒ کے گھر پر جمع ہونے لگے۔ تمام رات اہل شہر اکابر دارالعلوم اور طلبہ کی آمد و رفت جاری رہی۔ اس زمانہ میں دیو بند کے پوسٹ آفس میں رات کے وقت تار دینے کا نظم نہیں تھا بلکہ اوقات شب میں دیو بند کے اسٹیشن سے ٹیلی گرام دیا جاتا۔ چنانچہ اطراف ملک میں رات کو اسٹیشن سے تار دیئے گئے دہلی، لاہور، امرتسر، لدھیانہ وغیرہ متعلقین کو اس حادثہ کی اطلاع دی گئی۔ صبح تک دیو بند کے

قرب و جوار اور مضافاتی دیہات سے مسلمانوں کی آمد کا یہ عالم تھا کہ رہائشی محلہ انسانوں کا ایک سمندر نظر آتا۔

غسل کی تیاری :

چاشت کا وقت گزرنے کے بعد غسل کی تیاری ہوئی اور مکان کے ایک حصہ میں جسد خاکی منتقل کر دیا گیا۔ دارالعلوم کے بعض حضرات غسل دینے میں شریک ہوئے۔ مولانا عبدالواحد صاحب استاد دارالعلوم دیو بند اور حافظ محمد شریف صاحب بھی اس سعادت میں شرکت کر رہے تھے۔ غسل و کفن کے بعد جنازہ گھر میں رکھ دیا گیا۔ دہلی اور پنجاب کے بعض علاقوں سے ٹیلی گرام دیو بند پہنچ چکے تھے، جس میں نماز جنازہ میں شرکت کی خصوصی درخواست کے ساتھ اپنے پہنچنے کی اطلاع بھی دی گئی تھی۔

جنازہ میں جم غفیر :

اس زمانہ میں پنجاب اور دہلی سے آنے والی گاڑی کا دیو بند اسٹیشن پر تین بجے کراس ہوتا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ جنازہ کی نماز چار بجے کے قریب ہو۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ کو گھر سے لے جانے کی تیاری ہوئی۔ ہجوم کی بنا پر اور ہر شخص کے اس والہانہ شوق کو دیکھ کر کہ جنازہ کو ہاتھ لگ جائے، جنازہ میں بانس کی بڑی بڑی بلیاں باندھ دی گئی تھیں، اس اہتمام کے باوجود سینکڑوں کاندھا دینے کی سعادت سے محروم رہے اور کثیر تعداد نے اپنے ہاتھوں میں موجود رومالوں کو جنازہ سے چھو کر یہ آخری سعادت حاصل کی۔ ظہر کی نماز کے بعد امام الحدیث کا جنازہ اسی دارالعلوم کے وسیع ترین صحن میں لا کر رکھ دیا گیا، جس کے چمن زار کا یہ ایک شاداب پھول تھا اور جس کی چمن بندی کے لئے اس باغباں نے اپنی حیات مستعار کا نصف حصہ صرف کیا تھا۔ طلبہ کی آنکھوں نے اس پیکر علم کو سبز پوشاک میں

ملبوس دارالعلوم کے احاطے اور اس کی روشوں پر مصروف خرام دیکھا تھا۔ یہاں کے در و دیوار نے "قال اللہ و قال الرسول" کے اس شہید کی نوا نجی گوش ہوش سے سنی تھی۔

دلدوز اور بھیانک منظر :

آج سینکڑوں انسان سفید پوش میت کو اسی دبستان علم کے صحن میں اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے سواج سمندر کی سطح ٹھہر گئی ہو، یہ منظر کتنا دلدوز اور کتنا بھیانک تھا کہ جب مجمع کی کثرت کی بنا پر نودرہ کی عمارت کو ناکافی سمجھتے ہوئے تحتانی دارالحدیث کے تمام دروازے کھول کر جنازہ اس درسگاہ میں لاکر رکھ دیا گیا جہاں سالہا سال صحیح بخاری کے صحیفہ کو اس کوہ علم نے طلبہ کو سمجھایا تھا۔ نصف صدی کی اس اندوہناک تاریخ پر انسانوں کا ہجوم نہیں بلکہ در و دیوار بھی آہ و فغاں کر رہے تھے۔

میاں اصغر حسین نے نمازِ جنازہ پڑھائی :

صفیں سیدھی ہو گئیں اور دارالعلوم دیوبند کے ایک زاہد مرتاض میاں اصغر حسین نمازِ جنازہ پڑھانے کے لئے آگے آئے۔ اللہ اکبر کا بلند کلمہ کچھ اس انداز میں فضا میں گھل کر سامعین کے دلوں تک پہنچا کہ خدائے واحد کی کبریائی اور اس کے مقابلہ میں انسان کی بے بسی محسوس شکل میں سامنے آئی۔ ہجوم کی کثرت میں عارف باللہ کی گلوگیر آواز کو معلوم کرنا دشوار تھا۔ دارالحدیث کی وہ وسیع عمارت جس میں ایک ہزار کے قریب انسان ہر وقت سما سکتے ہیں بلکہ احاطہ مولسری، احاطہ دفتر اور صدر دروازہ سے باہر سامنے والی شاہراہ پر انسانوں کا ایک عظیم مجمع اشکبار آنکھوں اور سوختہ دلوں کے ساتھ دست بستہ کھڑا ہوا تھا۔ جا بجا مکبر متعین تھے جن کے دلدوز کلمات شدت غم سے حواس باختہ انسانوں کو چونکا تے۔ آج دیوبند میں ہڑتال تھی۔ ہندو دکانداروں نے بھی اس ماتمی ہڑتال میں حصہ لیا تھا۔ بوڑھے اور

نوجوان شریک نماز تھے۔ بچے اس حسرت انگیز منظر کے تماشائی، عورتیں مکانوں کی چھتوں پر وقف نظارہ تھیں، نماز ختم ہوئی اور جنازہ کو اپنے دوش پر لینے کے لئے مضطرب ہجوم میں ایک نئی کشمکش کا آغاز ہوا۔ یہ امام الحدیث کے پاکیزہ جسم سے اپنے ہاتھ مس کرنے کی آخری سعادت تھی جسے حاصل کرنے کے لئے سب ہی بیقرار تھے۔ جنازہ مدنی گیٹ سے باہر نکلا اور دارالعلوم سے عیدگاہ تک کا وہ فاصلہ جو چند منٹوں میں آسانی سے طے کیا جا سکتا ہے ۲ گھنٹہ سوا گھنٹہ کے طویل وقفہ میں طے ہوا۔ جنازہ قبرستان جاتے ہوئے مرحوم کے رہائشی مکان کے سامنے پہنچا تو مجمع بے قابو ہو گیا۔ اس گھر کی رونق اجڑ چکی تھی اور جانے والا اپنے ساتھ یہاں کی پوری زندگی لئے جا رہا تھا، اب یہ ایک بیوہ کا مسکن اور چند یتیموں کا اجڑا ہوا مکان ہی نہیں بلکہ علم و حکمت کا ایک خرابہ اور کمال علمی و عملی کا تباہ آشیانہ تھا، اس محلہ کی غیر مسلم آبادی جس نے بارہا مرحوم کو چلتے پھرتے دیکھا تھا جن کے بوڑھے اور نوجوان بچے اور عورتیں اس فرشتہ صورت انسان کے سامنے آتے ہی اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے جھک جاتے، آج جنازہ کو گریاں بریاں رخصتی سلام کر رہے تھے۔

شاہ منزل کے دروازہ پر دو معصوم بچے جو شفقت پدری سے تازہ تازہ محروم ہوئے تھے۔ اپنے باپ کے جنازہ کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کی عمر چار سے پانچ سال تک اور دوسرا سات و آٹھ سال کی عمر کے درمیان۔ ان دونوں میں سے بڑا اکبر شاہ مرحوم عمر کی چودہ بہاریں دیکھنے کے بعد اپنے شفیق باپ کی آغوش میں جا پہنچا اور یہ سیاہ نامہ والد مرحوم کا منثور مرثیہ لکھنے کے لئے ابھی زندہ ہے۔ مولوی سید حسن رضوی نے جو انور یہ لائبریری کے معتمد اور شاہ صاحب مرحوم کے خصوصی خادم ہیں، ان بچوں کو اپنے ساتھ لیا اور جنازہ کے پیچھے چلے شام کے تین اور چار کے درمیان کا وقت تھا کہ جنازہ عیدگاہ کے صحن میں رکھ دیا گیا۔ قبر تیار ہو چکی تھی لیکن پنجاب، دہلی، بجنور، مراد آباد سے آنے والوں کا انتظار کیا

جارہا تھا۔

بھائی ہمیں یہیں دفن کرنا :

مرحوم پھلوں کے شائق تھے۔ دیوبند کے بیر جو اپنی عمدگی ونفاست کی وجہ سے دور دور شہرت رکھتے ہیں۔ عیدگاہ کے قریب پٹھان کے مشہور باغ تھے۔ بیر کی فصل آتی تو معمولاً بیر کھانے کے لئے ان باغات میں تشریف لے جاتے۔ جہاں آج آپ کا مرقد ہے۔ طلبہ وہیں آپ کے لئے مصلیٰ بچھا دیتے، جس پر بیٹھ کر بیر تناول فرماتے۔ بارہا موجود خدام سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ بھائی ہمیں یہیں دفن کرنا۔

طویل القامہ جسیم وشجیم سفید پوش :

یہ وصیت اور آپ کی دیرینہ خواہش والدہ مرحومہ تک پہنچ چکی تھی۔ وفات کی صبح میں اپنا ایک طلائی زیور فروخت کر کے مرحومہ نے یہ زمین خرید لی اور نامور شوہر کی وصیت کو پورا کرنے کی سعادت ان کے حصہ میں آئی۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ دارالعلوم سے اختلاف کی بنا پر مرحوم کے برادر نسبتی حکیم سید محفوظ علی صاحب نے اکابر دارالعلوم کے ساتھ قبرستان قاسمی میں دفن کرنے سے گریز کیا لیکن یہ بھی معلوم نہیں کہ مدفن کے لئے اس زمین کو شاہ صاحب نے کس خصوصیت کی بنا پر انتخاب کیا تھا۔ ہجوم برابر بڑھ رہا تھا اور جن مخصوص حضرات کا انتظار تھا، وہ بھی پہنچ چکے تھے۔ جنازہ لحد میں اُتارنے کے لئے آگے بڑھایا گیا، قرب و جوار میں موجود درختوں پر بھی آدمی چڑھ چکے تھے جس سے بعض تناور درختوں کے تنے ٹوٹ کر گرے لیکن بے قابو ہجوم کو کنٹرول کرنا ممکن نہیں تھا۔ میت قبر پر لاکر رکھی گئی تو ایک طویل القامہ جسیم وشجیم سفید پوش سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹا ہوا مجمع کو چیرتا پھاڑتا آگے آیا اور ایک لمبی جست لگا کر جنازہ تک پہنچ گیا۔ وہ چادر جو میت کے اوپر تھی اسے کھینچ کر اس

تیزی سے فرار ہوا کہ ہزاروں انسانوں کا ہجوم اس کے تعاقب میں ناکام رہا۔ چار اور پانچ کے درمیان اس گنجینۂ علوم کو زیرِ زمین دفن کر دیا گیا۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى۔

دنیا سے علم اُٹھ جائیگا :

حافظ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی میت لحد میں اُتار کر مٹی دی جارہی تھی تو آپ کے ایک نامور شاگرد آگے بڑھے اور فرمایا کہ : ’’ھٰکَذَا یَذْهَبُ الْعِلْمُ‘‘ تشریح اس ارشاد کی خود ان کی زبانی سنئے :

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ دنیا سے علم اُٹھ جائے گا۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ علم دنیا سے کیونکر اُٹھے گا، لیکن رئیس العلماء ابن عباسؓ کی موت نے بتادیا کہ دنیا سے علم کے اُٹھنے کی یہ صورت ہوگی۔

علم وکمال کی جیتی جاگتی ہستی دفن کردی گئی :

عیدگاہ دیوبند کے قریب ایک گوشہ میں وادی لولاب کے کسی ایک انسان کو دفن نہیں کیا گیا بلکہ کمال علم اور کمال عمل کی ایک جیتی جاگتی ہستی دفن کر دی گئی۔ یہ تنہا انور شاہ کی وفات نہیں بلکہ چمنستان علم سے فصلِ بہار کی رخصت، نہال علم کے پھولوں سے بہجت و شادابی کا خاتمہ، حدیث وتفسیر فقہ وادب معانی وبیان منطق وفلسفہ اور ان تمام علوم کا زوال تھا جو مرحوم کی شخصیت میں مبدأ فیاض کی عنایت سے جمع ہوگئے تھے۔ گردش لیل ونہار کو روکے اور امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری کی رحلت، حافظ ابن تیمیہ کی موت، ابن حجر عسقلانی کا ارتحال، امام غزالی کا سانحہ، محی الدین ابن عربی کی وفات، فخر رازی کا عالم آب وگل سے سفر، ابن رشد اور جاحظ کا دنیا سے پردہ اور کسائی کے چہرہ پر موت کے آثار، یہ سب منظر

دیکھنے والوں نے اس وقت دیکھے جب امام العصر کی میت کو زیرِ زمین رکھا جا رہا تھا۔ یہ دنیا
اپنی زندگی کے ان گنت سال گذار چکی اور خدا جانے کہ اس کی عمر ابھی کتنی باقی ہے لیکن علم کی
محفلیں انور شاہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتیں اور جب تک اس کائنات میں علم وفن اور دین و
دانش کے زمزمے بلند رہیں گے یہ فرہادِ کمال بھی زندہ و پائندہ رہے گا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عشق سے ہوں گے جن کے دل آباد
قیس مرحوم کو کریں گے یاد

اخبارات کا ماتم اور دیوبند میں تعزیتی جلسہ :

اگلے روز ہندوستان کے مسلم اخبارات نے سیاہ حاشیوں کے ساتھ علامہ مرحوم
کے سانحہ وفات کی دلدوز خبر شائع کی۔ ظفر علی خان مرحوم کے "زمیندار"۔ غلام رسول مہر کا
"انقلاب" بجنور کا اخبار "مدینہ"۔ مولانا مظہر علی کا "الامان" اور دینی علمی رسالے مدتوں
اس حادثہ پر ماتم کرتے رہے۔ غیر منقسم ہندوستان کا کوئی مدرسہ ایسا نہ تھا جہاں تعزیتی جلسے
کے ساتھ قرآن خوانی نہ ہوئی ہو۔ انجمنوں نے تعزیتی قراردادیں پاس کیں اور ہزاروں کی
تعداد میں قرآن ختم کئے گئے۔ ان جلسوں میں تین جلسے تاریخی شہرت کے مالک ہیں۔

علامہ اقبالؒ کا خراجِ تحسین :

سب سے پہلا جلسہ لاہور کا ہے، جس میں علماء وفضلاء کے ساتھ شاعرِ مشرق ڈاکٹر
اقبال مرحوم نے اس شعر کے ساتھ تقریر شروع کی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

فرمایا: "اسلام کی آخری پانچ سو سالہ تاریخ مولانا انور شاہ کشمیری کی نظیر پیش

کرنے سے عاجز ہے۔ ایسا بلند پایہ عالم اور فاضل جلیل اب پیدا نہ ہوگا۔ وہ صرف جامع
العلوم قسم کی ایک شخصیت ہی کے مالک نہیں تھے بلکہ عصر حاضر کے دینی تقاضوں پر بھی ان کی
پوری نظر تھی۔ میں نے جدید فقہ کی تدوین کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا اور اس موضوع پر ان
سے گفتگو بھی رہی، جس طرز پر فقہ کی تدوین میرے پیش نظر تھی اس کے لئے مناسب
شخصیت ان کے سوا عالم اسلام میں کوئی نہ تھی۔ دیوبند سے علیحدگی کے بعد لاہور کے قیام کی
تجویز میں نے ان کے سامنے رکھی، جسے فی الجملہ مرحوم نے قبول بھی کر لیا تھا لیکن اہل
گجرات کے اصرار پر آپ ڈابھیل تشریف لے گئے اور وقت کی سب سے بڑی ضرورت کی
تکمیل بدقسمتی سے نہیں ہو سکی۔ اب میں مایوس ہوں کہ اس عظیم ترین کام کے لئے کوئی
شخصیت موزوں نظر نہیں آتی۔

آج علم کا آفتاب غروب ہو گیا :

دوسرا تعزیتی جلسہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کا ہے جہاں آپ کے جانشین مولانا شبیر
احمد عثمانی نے علماء، طلباء اور گجرات کے عام باشندوں کو اپنے ان دلدوز کلمات سے بے چین
کر دیا۔ فرمایا کہ "آج علم کا آفتاب غروب ہو گیا اور کمالات کا اُجالا تاریکیوں کی لپیٹ میں
ہے۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم کی وفات اسلام کا وہ بڑا حادثہ ہے جس کے نتیجہ
میں طلبہ نہیں بلکہ اہل فضل وکمال یتیم ہو گئے۔ طلبہ کے لئے تو الحمد للہ ہم لوگ کافی ہیں لیکن
ہماری مشکلات علمی کا حل کرنے والا دنیا سے اٹھ گیا۔ بلاشبہ آپ کی وفات سے ایک ایسا خلا
پیدا ہو گیا جس کا پُر ہونا بہت مشکل ہے۔ عام طور پر دنیا آپ کو بے نظیر قوی الحفظ اور وسیع
العلم فاضل کی حیثیت سے جانتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ آپ کا تعارف ناقص ہے۔ مجھے
یقین ہے کہ آپ کی شخصیت میں علماء متقدمین کے کمالات اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ

کمالاتِ انوری کا ہر پہلو فخر روزگار شخصیتوں کا مکمل عکس نظر آتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اے شبیر! تم نے ابن حجر عسقلانی کو دیکھا ہے یا ابن دقیق العید سے تمہاری ملاقات ہوئی یا تم کو سلطان العلماء عز الدین بن عبد السلام کی زیارت کی سعادت نصیب ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان شخصیتوں سے نیاز کا موقعہ ملا، زمانہ کی گردش کا فرق ہے ورنہ حضرت شاہ صاحب مرحوم اگر قدیم صدیوں میں پیدا ہوئے ہوتے تو کتب سیر وسوانح میں ان کا ذکر انہیں مذکورہ اشخاص کے پہلو بہ پہلو کیا جاتا۔ تشبیہ واستعارہ کی زبان میں حضرت مرحوم کی زیارت متقدمین علماء کی زیارت اور ان سے شرف ہمکلامی ہے۔ اس لئے میرے نزدیک ان کی وفات ابن حجر کا سانحہ ابن دقیق العید کی رحلت اور سلطان العلماء کا دنیا سے اٹھ جانا ہے۔

مجمع تصویر غم بن گیا:

ڈابھیل کے باشندوں سے سنا ہے کہ مولانا عثمانی کے درد انگیز کلمات نے پورے مجمع کو تصویر غم بنا دیا۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ایک ہفتہ تک بند رہا اور صبح وشام ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی اور کلمہ طیبہ کا ورد ہوتا رہا۔

تیسرا تعزیتی جلسہ وفات سے اگلے دن صبح کو دار العلوم دیوبند کے دار الحدیث کی وسیع عمارت میں ہوا، جس میں تمام اکابر دار العلوم دیوبند خصوصاً مولانا حسین احمد مدنیؒ نے تعزیتی تقریر فرمائی۔ تعزیتی جلسہ شروع ہوا تو طلباء دار العلوم بیقراری سے رو رہے تھے۔ مولانا مدنیؒ نے اشکبار طلبہ سے فرمایا کہ اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں بڑے بڑے حادثے اور اہم شخصیتوں کی وفات کا حادثہ پیش آیا۔ سرور کائنات ﷺ کی وفات اور خلفائے راشدین کی رحلت اسلام پر ایک سانحہ عظیم تھا لیکن اس وقت بھی صبر سے کام لیا گیا

آپ بھی صبر سے کام لیں۔ بلاشبہ حضرت شاہ صاحب مرحوم کی وفات سے علماء وطلبہ یتیم ہو گئے۔ فضل وکمال، تبحر علمی، وسعت معلومات اور قوت حافظہ میں آپ کی نظیر نہیں تھی۔ میں نے ہندوستان اور عالم اسلام کے نامور علماء کو دیکھا اور ان سے ملاقات کی ہے لیکن علامہ کشمیری مرحوم کی نظیر کہیں نہیں پائی۔ جلسۂ تعزیت کے اختتام پر ایک صاحب نے فارسی کے تعزیتی اشعار پڑھے تو آپ پر رقت طاری ہو گئی۔ دار العلوم دیوبند میں تین روز مسلسل قرآن خوانی ہوتی رہی۔ دہلی میں جمعیۃ العلمائے ہند کی جانب سے ایک جلسۂ تعزیت ہوا، جس میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید مرحوم نے اس روح فرسا واقعہ پر غم انگیز تقریریں کیں۔ غرض یہ کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں تعزیتی اجلاس، تعزیتی قرار دادیں اور قرآن خوانی کا سلسلہ تین مہینہ تک جاری رہا۔

عالِم کی موت عالَم کی موت ہے:

اہل اللہ کی وفات عام انسانوں کی موت نہیں بلکہ جناب رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”عالِم کی موت عالَم کی موت ہے“۔

یہ واقعہ ہے کہ کسی عالم ربانی کے سانحہ پر انسان ہی ماتم نہیں کرتے بلکہ حدیث سے ثابت ہے کہ زمین وآسمان بھی اس کی موت پر اشکبار ہوتے ہیں۔ حدیث ہی میں تو ہے کہ اہل علم کے لئے کائنات کا ذرہ ذرہ دعا گو رہتا ہے تا آنکہ سمندر کی تہ میں مصروف گردش مچھلیاں بھی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ اہل اللہ کے فیوض سے کائنات کی ہر چیز فائدہ اٹھاتی ہے۔ آفتاب نکلتا ہے تو اس کی ضوفشانی کے لئے کوئی مخصوص علاقہ نہیں۔ اسی طرح جب وہ غروب کرتا ہے تو تاریکی سب جگہ چھا جاتی ہے تو اہل اللہ اور علماء کے وجود سے پوری دنیا

روشن ومنور اور ان کی موت پر پوری دنیا تاریک اور ظلمت ہر طرف محیط۔ خدا تعالیٰ اہل اللہ کی وفات سے پہلے اس پیش آنے والے حادثہ کی اطلاع بھی دے دیتے ہیں۔

آفتاب ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا:

چنانچہ آپ کی علالت کا آخری دور گذر رہا تھا تو حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے صاحبزادے نے جو اس وقت دارالعلوم میں طالب علمی کرتے تھے، خواب میں دیکھا کہ آفتاب ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ مغرب کی نماز حضرت شاہ صاحبؒ کی خانقاہ کی مسجد میں ادا کی۔ بعد نماز ان صاحبزادے نے اپنا یہ خواب حضرت موصوف کو سنایا، سن کر فرمایا کہ بھائی کسی بہت بڑے عالم کی وفات ہوگی اور ممکن ہے کہ میری ہی ہو۔

اس خواب کے چند روز بعد ہی مرحوم کا سانحۂ وفات پیش آ گیا۔ بلاشبہ آپ اپنے علم وفضل کے اعتبار سے ایک درخشاں آفتاب تھے اور آپ کا حادثہ آفتاب علم کا ٹوٹ کر گرنا تھا۔ وفات کے بعد متعدد لوگوں نے ایسے خواب دیکھے جو آپ کی مغفرت کاملہ اور نجات کی جانب مشیر ہیں۔

یہ کس کا جنازہ ہے:

مولوی عبدالواحد صاحب نے ایک رات یہ خواب دیکھا کہ ایک جنازہ ہے اور اس کے پیچھے اتنا بڑا ہجوم جسے شمار کرنا بھی ممکن نہیں۔ مخلوق جنازے کے پیچھے دوڑ رہی ہے اور ہجوم بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ میں بھی اسی ہجوم میں شریک ہوگیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے؟ بتایا گیا کہ یہ جناب رسول اکرم ﷺ کا جنازہ ہے جسے لوگ تبرکاً اور حصول برکت کے لئے کاندھا دینے کے لئے دوڑ رہے ہیں۔ میں نے ہجوم سے کہا کہ ذرا ٹھہرو ٹھہرو۔ میں جناب رسول اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کی زیارت کرنا چاہتا ہوں، میری

بیقراری پر جنازۂ مبارک زمین پر رکھ دیا گیا اور ہجوم نعش مبارک کے قریب سمٹنے لگا۔ میں نے چہرۂ مبارک سے چادر ہٹائی تو وہ بعینہٖ چہرۂ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا تھا۔

نجات ومغفرت کی بشارت:

اس کے علاوہ مولانا حکیم عبدالرشید صاحب محمود نے حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا کہ حضرت مرحوم سبز پوشاک میں ہیں اور بے ریش و بروت۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ اس خواب کو دیکھ کر مجھے حیرانی وتشویش ہوئی۔ غالباً حضرت تھانویؒ کو خواب لکھ کر بھیجا تو حضرتؒ نے تحریر فرمایا کہ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی نجات ومغفرت اور اہل بہشت میں سے ہونے کی بشارت ہے۔ چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اہل جنت جُرْدٌ مُرْدٌ یعنی بے ریش وبروت ہوں گے جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ بہشت بریں کی لذتوں اور وہاں کی راحتوں سے استفادہ کے لئے شبابی عہد کو لوٹا دیں گے۔ ظاہر ہے کہ ازکار رفتہ بوڑھے کسی آرام دہ ماحول سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ شبابی دور میں نہ صرف یہ کہ قویٰ برسرکار ہوتے ہیں بلکہ اس زمانے کی امنگیں انسان کو ہر نعمت سے صحیح استفادہ کا بھرپور موقعہ بھی دیتی ہیں تو یہ خدائے تعالیٰ کی مزید نعمت ہے کہ بہشت سے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے قویٰ بھی مناسب عنایت فرمائے۔

مزار اور لوح مزار:

عرض کر چکا ہوں کہ آپ کو عیدگاہ دیوبند سے متصل ایک قطعۂ زمین میں دفن کیا گیا۔ اس زمین پر آپ کی سب سے پہلی قبر تھی لیکن بہت جلد آپ کی بڑی صاحبزادی عابدہ خاتون وفات پاکر یہیں دفن ہوگئیں۔ دیوبند میں آپ کے چند خصوصی معتقدین بھی اسی مقبرہ میں دفن ہیں۔ مجھ سے بڑا بھائی محمد اکبر شاہ مرحوم تیرہ چودہ سال کی عمر میں غریق

رخصت ہو کر اپنے نامی گرامی والد کے قدموں کے نیچے سوتا ہے۔ آپ کے برادر نسبتی حکیم محفوظ علی صاحب، والدہ مرحومہ اور راقم الحروف کی پہلی اہلیہ مجیدہ خاتون بائیں جانب دفن ہیں۔ پورے خاندان کے بڑے چھوٹے اور معصوم بچے تین پچیس کی تعداد میں ان سب کی قبریں والد مرحوم کے ساتھ ہیں۔ مزار کی داہنی جانب اس ظلوم وجہول نے ان تمناؤں کے ساتھ خالی رکھی ہے کہ رحمت حق ایک سراپا عصیان کو اسی مطہر زمین کا پیوند خاک بنائے۔ والامر بید اللہ۔

وفات کے چند روز بعد مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم دہلی سے لوح مزار تیار کرا کر لائے جس کا مضمون مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا اور کتابت مشہور خطاط محمد یوسف دہلوی کی ہے۔ لوح مزار کا مضمون بھی ایک فاضل روزگار کے قلم کی تراوش ہونے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ یہاں نقل کر دیا جائے۔ الفاظ یہ ہیں:

''مرقد مبارک دستور حضرت رئیس الحکماء والمتکلمین، خاتم الفقہاء والمحدثین، شیخ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ کہ بتاریخ ۳ رصفر ۱۳۵۲ھ بوقت نصف شب از دار الفنا بسوئے دار البقاء رحلت فرمود''۔

اس لوح مزار کے ساتھ مسنون خام قبر عیدگاہ کے دامن میں زیارت گاہ خاص و عام اور مرجع اہل علم و کمال ہے۔ مرحوم کی عمر کل ساٹھ سال کی ہوئی۔ (نقش دوام ص ۲۷۵)

علوم حدیث کے حافظ:

حضرت امام کشمیریؒ کو اکابر علماء و مشائخ اور زعماء نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

''مولانا محمد انور شاہ مرحوم وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد

میں بے مثال تھے۔ علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قَالَ اللّٰهُ وَ قَالَ الرَّسُوْلُ کا نعرہ بلند کیا''۔ (علامہ سید سلیمان ندوی)

عصر حاضر کا کامل ترین عالم ربانی:

''حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کامل ترین عالم ربانی کی وفات ہے۔ جن کی نظیر مستقبل قریب میں متوقع نہیں۔ طبقہ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا تبحر کمال، فضل و ورع و تقویٰ جامعیت و استغنا مسلم تھا۔ موافق ہو یا مخالف ان کے سامنے تسلیم و انقیاد سے گردن جھکا دیتا تھا۔ (مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ)

چمن ولی اللٰہی کے ثمردار درخت:

مولانا محمد انور شاہ صاحب چمن ولی اللٰہی کے ایک بار آور اور ثمردار درخت تھے جو اپنے گنجان سایہ سے تمام عالم کو مستفید کر رہے تھے اور جس درخت کے شیریں پھلوں سے ایک عالم اپنی گرسنگی کو دور کر رہا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ ایک فیض جاری کے ایسے سرد اور شیریں چشمہ تھے جس کے پانی کا بہاؤ نہ صرف ہندوستان تک محدود تھا بلکہ تمام عالم اسلامی اس چشمہ سے سیراب ہو رہا تھا۔ اس کا منبع اگرچہ دیوبند میں تھا لیکن اس کا دھارا یمن، بخارا، جاوا، مصر اور ترکی میں پڑتا تھا''۔ (سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم)

انور شاہؒ کے سینے میں کتب خانہ محفوظ ہے:

''میں ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہیں اور ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو صحیحین حفظ یاد ہیں لیکن ایسا عالم کہ کتب خانہ کا کتب خانہ ہی

جس کے سینے میں محفوظ ہو سوائے حضرت مولانا انور شاہ کے کوئی نہیں دیکھا۔

میں نے ہندوستان' حجاز' عراق اور شام وغیرہ ممالکِ اسلامیہ کے علماء و فضلاء سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی لیکن تبحر علمی' وسعتِ معلومات اور علوم نقلیہ (یعنی قرآن کریم و حدیث رسول اکرمؐ) اور علوم عقلیہ (یعنی فلسفہ' تاریخ اور ہیئت وغیرہ) کے احاطہ میں شاہ صاحبؒ کا کوئی نظیر نہیں پایا"۔ (شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ)

جی چاہتا ہے شاہ صاحب کے چہرے کو دیکھتا رہوں :

☆ "حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کی نظیر علوم میں خصوصاً علم حدیث میں پیش کرنے سے تمام ایشیا عاجز ہے۔ جی چاہتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے چہرے کو دیکھتا ہی رہوں"۔ (بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان مرحوم)

☆ "اس قسم پر کوئی کفارہ نہیں جو اس امر پر کھائی جائے کہ مولانا انور شاہؒ اس زمانے میں بے نظیر عالم ہیں"۔ (امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ)

☆ "صحابہؓ کا قافلہ جا رہا تھا' یہ پیچھے رہ گئے تھے"۔

(خطیب العصر رئیس الاحرار سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ)

☆ "شاہ صاحبؒ سلفِ صالحین کا نمونہ ہیں اور علم کا ایک چلتا پھرتا کتب خانہ ہیں"۔ (مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ)

میں نے کتابوں میں یہ مسئلہ نہیں دیکھا :

☆ "مجھے جب بھی کسی مسئلہ میں کوئی دشواری پیش آتی تو کتب خانہ دارالعلوم کی طرف رجوع کرتا' اگر کوئی چیز مل جاتی تو فبہا ورنہ پھر حضرت شاہ صاحبؒ سے رجوع کرتا۔ شاہ صاحبؒ جو جواب دیتے اُسے آخری اور تحقیقی پاتا اور اگر حضرت شاہ صاحبؒ نے کبھی

یہ فرمایا کہ میں نے کتابوں میں یہ مسئلہ نہیں دیکھا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ اب یہ مسئلہ کہیں نہیں ملے گا اور تحقیق کے بعد ایسا ہی ثابت ہوتا"۔ (مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ)

☆ "اگر مجسم علم کسی کو دیکھنا ہو تو مولانا انور شاہ کو دیکھ لے"۔

(مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ)

شاہ صاحب کے درجہ کا عالم :

☆ "میں نے شاہ صاحبؒ کے علاوہ اس درجہ کا کوئی عالم نہیں دیکھا جو امام بخاریؒ، حافظ ابن حجرؒ، ابن تیمیہؒ، ابن حزمؒ اور شوکانیؒ وغیرہ کے نظریات پر تنقیدی نظر و محاکمہ کر سکتا ہو اور ان حضرات کی جلالتِ قدر کا پورا لحاظ رکھ کر بحث و تحقیق کا حق ادا کر سکے"۔

(علامہ محدث علی حنبلی مصریؒ)

☆ "علامہ ابن الہمام (صاحب فتح القدیر متوفی ۸۶۱ھ) کے بعد انور شاہؒ کے پایہ کا کوئی دوسرا شخص نہیں ہوا جو متون احادیث سے نئے نئے مباحث نکات کے استنباط و استخراج کی اہلیت رکھتا ہو اور یہ وقفہ (شاہ صاحبؒ اور ابن ہمامؒ کے درمیان) کوئی معمولی وقفہ نہیں ہے"۔ (محدث و مفسر علامہ زاہد الکوثریؒ)

☆ سلطنتِ ترکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری نے حضرت شاہ صاحبؒ کی تصنیف "مرقاۃ الطارم" دیکھ کر فرمایا کہ :

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ فلسفہ و کلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں موجود ہے۔ جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے اس رسالہ کو اس سب پر ترجیح دیتا ہوں اور اسفار اللہ شیرازیؒ کی ان چار مجلدات کبیرہ پر بھی"۔ (شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری)

☆ ''علامہ انور شاہ صاحبؒ متاخرین میں جس پائے کے محدث گذرے ہیں وہ اونچے اہل علم سے مخفی نہیں۔حق یہ ہے کہ حدیث کے وسیع و دقیق فن کی مہارت کا جو سلسلۂ الذہب قرونِ اولیٰ سے چلا تھا موصوف اس کی آخری کڑی تھے اور اب آپ کے بعد پوری دنیائے اسلام میں اس شان کے محدث اور حافظ حدیث کم از کم ہماری معلومات کی حد تک عنقا کے درجے میں ہیں۔حدیث کو سمجھنے والے' اس پر عمدگی سے کلام کرنے والے اور اس کے مطالب و مفاہیم کو دلنشین پیرائے میں بیان کرنے والے تو بفضلہٖ تعالیٰ اب بھی ہیں لیکن جلیل القدر حفاظ حدیث کی یہ مخصوص شان کہ صدہا احادیث لفظ بہ لفظ حافظے میں محفوظ ہوں اور بروقت ان کا استحضار بھی ہو۔علامہ انور شاہ صاحبؒ کے بعد کہیں نظر نہیں آتی''۔

(مولانا عامر عثمانی مرحوم)

☆ ''میں حضرت شاہ صاحبؒ کے یگانہ کمالات اور ان کے تبحر علمی' محیر العقول حافظہ اور فن حدیث میں ان کے علو مرتبہ' نیز ان کی حیرت انگیز وسعت نظر سے نہ صرف واقف بلکہ اس کا معتقد ہوں لیکن مجھے ان سے تلمذ کا شرف حاصل نہیں۔میری واقفیت بالواسطہ اور ان کے تلامذہ کے ذریعے سے ہے''۔ (مفکر ملت اسلامیہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

☆☆☆☆☆☆

باب : ۱۱

دو تاریخی دستاویزات

۱۔ مقدمہ بہاولپور کی تفصیلی رپورٹ

۲۔ علامہ رشید رضا کی آمد پر علماءِ دیوبند کے عقائد، مسلک و منہج پر مفصل خطاب

مقدمۂ بہاولپور کی اجمالی روئیداد

حضرت امام کشمیریؒ کا مقدمۂ بہاولپور میں کردار ایک تاریخی کردار ہے جس کے بعض گوشے مختلف ابواب میں نقل ہوتے آئے ہیں۔ ذیل میں سید محمد ازہر شاہ قیصر کے مرتب کردہ مقدمۂ بہاولپور کی اجمالی رپورٹ نذر قارئین ہے، جس سے تمام تر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے .... (ادارہ)

بہاولپور کے تاریخی مقدمہ میں شہادت کے لئے رسول اللہ ﷺ کے جانبدار ہو کر جب حضرت شاہ صاحبؒ تشریف لے گئے۔ احقر حضرت کے ہمراہ تھا۔ مولانا اسعد اللہ صاحب سہارنپوری اور احقر دونوں کو حضرت شاہ صاحبؒ نے مختار مقدمہ بنوایا۔ چنانچہ احقر کو ۱۹ یوم سعادت رفاقت نصیب ہوئی۔ حضرت کو ان ایام میں مرض بواسیر کا دورہ شدید تھا، خون کثرت سے آ تا رہا۔ صفرا کا غلبہ ہوگیا تھا، پیاس شدت کی رہتی تھی، ضعف میں قوت اور قوت میں ضعف ہوگیا تھا۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کا پہلے بیان ہوا۔ ایک دن بیان دوسرے دن جرح ہوئی۔ مولانا مرتضیٰ حسنؒ چاندپوری کا دو دن بیان ہوا، تیسرے دن جرح ہو کر پانچویں دن عدالت کا وقت شروع ہونے سے ایک گھنٹہ بعد تک رہی، پھر حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں اطلاع دی گئی، کار سے تشریف لائے، زائرین کا ہجوم تھا۔ ڈسٹرکٹ جج صاحب مرحوم نے نہایت اعلیٰ انتظام فرمایا تھا تاکہ کاروائی سننے والوں کو

وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

جب حضرت شاہ صاحبؒ نے کمرۂ عدالت میں قدم مبارک رکھا، تمام حاضرین اُٹھ کھڑے ہوئے، تا آنکہ مرزائی بھی کھڑے ہوئے۔ احقر نے حضرت کے ضعف و نقاہت کے باعث جج صاحب سے عرض کر کے آرام کرسی کا انتظام کروایا تھا کہ حضرت بیٹھ کر بیان دیں گے۔ ہم دونوں کے لئے بھی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں لیکن ہمیں تو اوپا کھڑے ہی رہنا تھا اور کام بھی کرنا تھا، اس لئے دونوں کرسیاں اُٹھوادی تھیں۔ کمال یہ کہ مرزائی ہر دو مختاران مدعا علیہ بھی اپنی اپنی کرسیاں اُٹھوا کر زمین پر بیٹھ گئے۔

حضرت کے حکم سے حوالہ جات کتب نکال کر پیش کرنا بھی احقر کے سپرد تھا اور حضرت کی بین کرامت تھی، جس عبادت کے متعلق ارشاد فرماتے، احقر فوراً نکال کر پیش کرتا تھا اور حضرت پڑھ کر جج صاحب کو سناتے تھے۔ بیان شروع ہوتے ہی تمام کچہری میں سناٹا چھا گیا تھا، حاضرین ہمہ تن گوش تھے، حضرت کا بیان نہایت سکون واطمینان سے سن رہے تھے، باوجود ضعف کے آواز اتنی بلند ہو جاتی تھی کہ عدالت کے اندر باہر سب کو پورا بیان سنائی دیتا تھا۔ مرزائی لوگ مولانا مرتضیٰ حسن کے بیان میں شور مچاتے تھے لیکن حضرت کے بیان میں سب کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ ایسا منضبط اور اصولی بیان: لاعین رأت ولا اذن سمعت۔

جج صاحب کی آرزو تھی کہ بیان ایسا ہونا چاہئے جس سے مجھے نتیجہ تک پہنچنا آسان ہو جائے کہ کن وجوہ کی بناء پر کسی کی تکفیر کی جاسکتی ہے۔ سو حضرت کا بیان ماشاء اللہ ایسا ہی تھی۔ جج صاحب نہایت محظوظ ہو رہے تھے کہ ان کی مراد بر آئی۔ وہ فرماتے تھے۔ جزیات منتشرہ کی بھرمار سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ افسوس ہے کہ "بیانات علماء ربانی" کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں وہ تفصیلات درج نہیں ہیں۔ نیز جو عبارات اثناء بیان میں تشریحات وتفسیرات کے ساتھ پیش فرمائی جاتی تھیں، وہ بھی پوری

درج نہیں کی گئیں۔ صرف اتنا بیان طبع ہوا جو حضرت شاہ صاحبؒ جج صاحب کو املاء کرواتے تھے۔ اس میں حوالہ جات کی عبارات کا صرف اول اور آخری لفظ لے لیا گیا ہے۔ حالانکہ حضرت شاہ صاحبؒ پوری عبارات مع تشریحات وتفسیر سناتے تھے۔ اگر ذرا تکلیف انجمن مؤید الاسلام بہاولپور کے منتظمین گوارا فرماتے یا کم از کم احقر لائل پوری کو حکم فرماتے تو حضرت شاہ صاحبؒ کا پورا مشرح مفصل ومبسوط بیان ۱۶۰ صفحات پر آ جاتا۔ اس لئے کہ احقر بھی پورا پورا بیان ساتھ ساتھ لکھتا جاتا تھا۔ فیصلہ مقدمہ پڑھئے، معلوم ہو جائے گا کہ فاضل جج نے اپنے صادق مصدوق فیصلے کا مدار زیادہ تر حضرت شاہ صاحب ہی کے محققانہ بیان پر رکھا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا بیان سننے کے لئے پنجاب، بلوچستان، کراچی اور دیگر دور دراز علاقوں کے علماء وفضلاء ورؤساء اور آفیسران ریاست آئے ہوئے تھے۔ انجمن مؤید اسلام بہاولپور نے جو تمہیدی الفاظ حضرت کے بیان "البیان الازہر" پر لکھے ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

"شیخ الاسلام والمسلمین اسوۃ السلف و قدوۃ الخلف حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری قدس اللہ اسرارھم کی بلند ہستی کسی تعارف اور توصیف کی محتاج نہیں۔ آپ کو مرزائی فتنے کے رد واستیصال کی طرف خاص توجہ تھی، حضرت شیخ الجامعہ صاحب کا خط شاہ صاحبؒ کی خدمت میں دیو بند پہنچا تو حضرت ڈابھیل تشریف لے جانے کا ارادہ فرما چکے تھے اور سامان سفر باندھا جا چکا تھا، مگر مقدمہ کی اہمیت کو ملحوظ فرما کر ڈابھیل کی تیاری کو ملتوی فرمایا اور ۱۹ اگست ۱۹۳۲ء کو بہاولپور کی سرزمین کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا۔ حضرت کی رفاقت میں پنجاب کے بعض علماء، مولانا عبد الحنان خطیب آسٹریلیا مسجد

لاہور و ناظم جمعیۃ علماء پنجاب مولانا محمد صاحب لائل پوری فاضل دیوبند، مولانا محمد زکریا صاحب لدھیانوی وغیرہم بھی تشریف لائے۔

ریاست بہاولپور اور ملحقہ علاقہ کے علماء اور زائرین اس قدر جمع ہوئے کہ حضرت کی قیام گاہ پر بعض اوقات بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی اور زائرین مصافحہ سے مشرف نہ ہو سکتے تھے"۔

۲۵/ اگست ۱۹۳۲ء کو حضرتؒ کا بیان شروع ہوا، عدالت کا کمرہ امراء و روساءِ ریاست و علماء کی وجہ سے پُر تھا۔ عدالت کے بیرونی میدان میں دور تک زائرین کا اجتماع تھا۔ باوجود یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ عرصہ سے بیمار تھے اور جسم مبارک بہت ناتواں ہو چکا تھا مگر متواتر پانچ روز تک تقریباً پانچ پانچ گھنٹے یومیہ عدالت میں تشریف لا کر علم و عرفان کا دریا بہاتے رہے۔ مرزائیت کے کفر و ارتداد اور دجل و فریب کے تمام پہلو آفتاب نصف النہار کی طرح روشن فرما دیئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان ساطع البرہان میں مسئلہ ختم نبوت اور مرزا کی ادعاء نبوت و وحی و مدعی نبوت کے کفر و ارتداد کے متعلق جس قدر مواد جمع ہے اور ان مسائل و حقائق کی توضیح و تفصیل کے لئے جو ضمنی مباحث موجود ہیں، شاید مرزائی نبوت کے رد میں اتنا علمی ذخیرہ کسی ضخیم کتاب میں یکجا نہیں ملے گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان پر تبصرہ کرنا خاکسار کے فکر کی رسائی سے باہر ہے، ناظرین بہرہ اندوز ہو کر حضرت شاہ صاحبؒ کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے اعلیٰ علیین میں مدارج بلند فرمائیں۔ آمین۔

حضرتؒ کا حافظہ اس وقت قابل دید و شنید تھا، جب حوالہ دیتے، کتاب کھولتے ہی فوراً انگلی مبارک عبارت پر ہوتی، جج صاحب لکھئے! عبارت یہ ہے، بعض دفعہ احقر کو فرماتے کہ عبارت نکال کر دے تا کہ دکھاؤں۔ بعض دفعہ صفحہ بھی ارشاد فرماتے، بیان بیٹھ کر

فرماتے لیکن حوالہ جات پیش فرماتے وقت کھڑے ہو جاتے۔ "توراۃ شریف" کی بعض آیات عربی الفاظ میں سنائیں اور اپنے دست مبارک سے لکھ کر جج صاحب کو دیں۔ چنانچہ ایک آیت احقر کو یاد ہے:

نابی مقربخ میحیخ کامرخ یاقیم لخ الوهخ الا و تشماعون ——
لی من قربک من احیک کاعیک یقیم لک الهک الیه تسمعون۔

ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام نے اپنے دست مبارک سے لکھ کر اس آیت کا بنی اسرائیل میں اعلان فرمایا —— فرمایا: جج صاحب لکھئے! ہمارا دین متواتر ہے اور دنیا میں کوئی دین متواتر نہیں۔ تواتر کی تعریف بیان فرما کر اس کے اقسام تواتر اسناد، تواتر طبقہ، تواتر قدر مشترک، تواتر توارث بیان فرمائے۔ فرمایا تواتر کی ایک قسم معنوی بھی ہے اور تواتر کی کسی ایک قسم کا منکر کافر ہے۔

مرزا غلام احمد نے تواتر کے جمیع اقسام کا انکار کیا ہے۔ جرح کے روز جلال دین شمس مرزائی مختار مدعا علیہ نے سوال کیا کہ آپ نے تواتر کے منکر کو کافر کہا ہے، حالانکہ یہ تو ایک اصطلاح ہے جو علماء نے گھڑ رکھی ہے۔ اس کا منکر کیسے کافر ہو سکتا ہے؟

ارشاد فرمایا کہ: تم لوگ مانتے ہو یا نہیں کہ یہ قرآن مجید وہی قرآن ہے جو حضور اکرم ﷺ پر نازل ہوا اور ہم تک محفوظ چلا آیا۔ جلال دین نے کہا ہم مانتے ہیں، فرمایا کہ اس حالت حفاظت کا نام تمہارے ہاں کیا ہے؟ جلال دین نے کہا "تواتر" فرمایا، اس کا منکر کافر ہوگا یا نہیں؟ مرزائی مختار نے اقرار کیا، فرمایا کہ میں یہی تو کہہ رہا ہوں۔

قادیانی مختار نے سوال کیا کہ امام رازیؒ نے تواتر معنوی کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ "فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت" میں بحر العلومؒ نے تصریح کی ہے۔ فرمایا، جج صاحب! ہمارے پاس "فواتح الرحموت" کتاب موجود نہیں ہے۔ ۳۲ سال

ہوئے میں نے یہ کتاب دیکھی تھی ان صاحب نے حوالہ دینے میں دھوکا دیا ہے۔ بحر العلوم امام رازیؒ کے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ جو حدیث ہے:

لا تجتمع امتی علی الضلالہ ۔ یہ تواتر معنوی کے درجہ کو نہیں پہنچتی، یہ نہیں کہ تواتر معنوی کے حجت ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ جج صاحب نے قادیانی مختار کو حکم دیا کہ اصل عبارت پڑھ کر سنایئے۔ اس نے ذرا تامل کیا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی کہ لاؤ میں عبارت سناتا ہوں۔ اس نے کہا کہ میں ہی سنا دیتا ہوں، جب سنایا تو وہی عبارت تھی جو حضرتؒ نے ارشاد فرمائی تھی۔ فرمایا: جج صاحب! یہ صاحب ہمیں مفحم کرنا چاہتے ہیں، لیکن میں چونکہ طالب علم ہوں، دو چار کتابیں دیکھ رکھی ہیں، میں ان سے ان شاء اللہ مفحم نہیں ہونے کا۔

قادیانی مختار نے سوال کیا، آپ نے فرمایا کہ مدعی وحی نبوت واجب القتل ہے تو رسول اللہ ﷺ نے ابن صیاد کو کیوں قتل نہ فرمایا بلکہ فاروق اعظمؓ کو بھی روک دیا۔ فرمایا: جج صاحب لکھئے ابن صیاد نابالغ تھا اور نابالغ کو شریعت میں قتل نہیں کیا جاتا۔

سوال: آپ نے فرمایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسیلمہ کذاب کے دو قاصد آئے۔ حضور ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم بھی مسیلمہ کا عقیدہ مانتے ہو؟ انہوں اثبات میں جواب دیا، تو فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو تم دونوں کو قتل کرتا۔ اب سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے رواج کا اتباع کیا؟

فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ "قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا" یہ بجائے خود تشریعی حکم ہے۔ نبی رواج کا متبع نہیں ہوتا بلکہ حکم خداوندی کا متبع ہوتا ہے۔

حضرت کی قیامگاہ پر زائرین کا ہجوم رہتا تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی موضوع پر تقریر فرماتے رہتے تھے۔ بہت سے لوگ حضرت سے بیعت بھی ہوئے، رات دن یہی شغل تھا

رات کے ایک بجے تک بیٹھے رہتے، قرآن و حدیث و فقہ، تصوف وغیرہا علوم و فنون کے دقیق دقیق مسائل علماء کرام و صوفیاء عظام دریافت کرتے رہتے۔ ہر ایک کے جواب میں ایسی محقق اور مبسوط تقریر فرماتے۔ گویا ساری عمر اسی میں لگائی ہے۔ ایک عالم دین نے مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدت شہود کے متعلق سوال کیا، بس پھر کیا تھا، تین دن عصر سے مغرب تک اور مغرب سے عشاء تک اسی پر بیان فرماتے رہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی عبارت زبانی سنا رہے ہیں۔ معارف لدنیہ میں یہ فرماتے ہیں، مکتوبات شریفہ میں یہ فرماتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ تحقیق ہے، عبقات میں شاہ اسماعیل شہیدؒ نے یوں فرمایا، حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ نے فتوحات میں یہ فرمایا ہے۔ نصوص الحکم میں یہ ارشاد ہوتا ہے، حضرت مولانا جامی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی نظموں پہ نظمیں وحدۃ الوجود پر طویل پڑھ کر سنا رہے ہیں۔

حضرت مولانا دین پوری نور اللہ مرقدہ بھی مع اپنے خدام کے تشریف فرما رہتے تھے۔ مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی، حضرت مولانا عبداللطیف ناظم مدرسہ مظاہر العلوم، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، حکیم عبدالرشید افسر الاطباء بہاولپور، غرض ہر طبقہ محظوظ ہوتا تھا۔ حضرت ناظم صاحب سہارنپوری بڑی عقیدت کے ساتھ دو زانو سامنے بیٹھے رہتے تھے اور استفادہ فرماتے رہتے تھے۔

مولانا شمس الدین بہاولپوری مرحوم کی کتب خانہ سے "معجم کبیر طبرانی" کا قلمی نسخہ منگایا۔ حضرت ناظم صاحب لے کر آئے۔ احقر کو حکم فرمایا کہ روزانہ مجھے اس میں سے احادیث نقل کر کے دیا کر، چنانچہ نشان دہی فرمائی جاتی اور احقر کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ فرمایا کہ قلمی کتاب کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے، میں آپ کو طریقہ سکھاتا ہوں۔ چنانچہ تھوڑی سی رہنمائی سے احقر نے خوب سمجھ لیا۔ معجم کے اس نسخہ میں کہیں اعراب و نقاط کا نام و نشان بھی

نہیں۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا محمد مرتضیٰ حسن مرحوم کے بیانات پہلے خود ملاحظہ فرماتے' جگہ جگہ رہنمائی فرماتے' جب خود تسلی فرما لیتے تو کچہری میں جانے دیتے' لیکن خود حضرت کوئی تیاری نہ فرماتے۔ ایک بجے شب تک تو جیسے اوپر گزرا وعظ و تلقین وارشاد و بیان مسائل ہوتا رہتا' صرف ایک گھنٹہ آرام فرماتے۔ دو بجے تہجد کے لئے اُٹھتے' فجر کی نماز تک مراقب رہتے' پاس انفاس میں مشغول رہتے' اول وقت نماز فجر کی امامت خود کرتے' پھر سورج نکلنے تک کچھ پڑھتے رہتے' چائے پی کر موٹر سے کچہری تشریف لے جاتے۔ سات بجے سے ایک بجے تک بیان ہوتا رہتا' ضعف ونقاہت بغایت تھا' لیکن تکان مطلقاً محسوس نہ فرماتے۔ تمام رفقاء سفر و دیگر علماء کا خوب اہتمام سے تفقد فرماتے رہتے' مجلس مشاورت میں خاص خاص علماء کو شامل فرماتے۔ احقر پر اتنی نوازشات وعنایات کی بارش ہوتی رہتی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ احقر نے قادیانیوں کی کتب سے بعض نئی باتیں نکال کر پیش کیں' بہت خوش ہوئے اور بار بار علماء کو بلا کر دکھاتے۔ جب تک احقر مجلس مشاورت میں حاضر نہ ہوتا' بات شروع نہ فرماتے۔ تخلیہ میں بھی مشورہ فرماتے اور باصرار فرماتے کہ تیری اس میں کیا رائے ہے۔

بہاولپور شہر میں جامع مسجد و دیگر مقامات پر قادیانیت کے خلاف تقریر کرنے کے لئے علماء کو بھیجتے رہتے تھے۔ دو دفعہ احقر کو بھی بھیجا' ان ایام میں اس قدر حضرتؒ کے چہرۂ مبارک پر انوار کی بارش ہوتی رہتی تھی کہ ہر شخص اس کو محسوس کرتا تھا۔ احقر نے بار ہا دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرما رہے ہیں' لیکن روشنی ایسی جیسے بجلی کے قمقمے روشن ہوں' حالانکہ اس وقت بجلی گل ہوتی تھی۔

بہاول پور جامع مسجد میں جمعہ کی نماز حضرت اقدسؒ پڑھایا کرتے تھے' بعد نماز کچھ بیان بھی ہوتا تھا' ہزاروں ہزار کا مجمع رہتا تھا۔ پہلے جمعہ میں فرمایا کہ:

''حضرات! میں نے ڈابھیل جانے کے لئے سامان سفر باندھ لیا تھا کہ یکایک مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ کا خط دیوبند موصول ہوا کہ شہادت دینے کے لئے بہاولپور آ جائیے۔ چنانچہ اس عاجز نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا اور بہاولپور کا سفر کیا۔ یہ خیال کیا کہ ہمارا نامۂ اعمال تو سیاہ ہے ہی' شاید یہی بات میری نجات کا باعث بن جائے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا جانبدار ہو کر بہاولپور میں آیا تھا''۔

بس اس فرمانے پر تمام مسجد میں چیخ و پکار پڑ گئی' لوگ دھاڑیں مار مار کر اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے' خود حضرت پر ایک عجیب کیفیت وجد طاری تھی۔ ایک مولوی صاحب نے اختتام وعظ پر فرمایا کہ شاہ صاحبؒ کی شان ایسی ہے اور آپ ایسے بزرگ ہیں' وغیرہ' حضرت فوراً کھڑے ہو گئے' فرمایا: حضرات ان صاحب نے غلط کہا ہے' ہم ایسے نہیں ہیں بلکہ ہمیں تو یہ بات یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ:

''ہم سے گلی کا کتا بھی اچھا ہے' ہم اس سے گئے گزرے ہیں''۔

سبحان اللہ' انکسار اور تواضع کی حد ہو گئی۔

لاہور اسی سفر کے سلسلہ میں دو روز قیام فرمایا تھا۔ آسٹریلین بلڈنگ کی مسجد میں بعد نماز فجر وعظ فرمایا' علماء و فضلاء عوام و خواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوتے تھے۔ بیان ہوتا تھا: ''اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو' مالک تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو''۔ غرض حضرت نے خطبہ شروع فرمایا: **الحمد لله نحمده و نستعينه الخ** ' وعظ کرسی پر بیٹھ کر فرما رہے تھے' احقر کے دل میں وسوسہ سا گزرا کہ مسجد میں تو شاید کرسی بچھانا سوئے ادب ہو۔ حضرت نے فوراً خطبہ بند کر دیا۔ فرمایا کہ مسجد میں کرسی بچھانا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ چنانچہ ''مسلم شریف'' میں روایت ہے کہ ایک سائل کے جواب دینے کے

لیے حضور ﷺ کے لیے مدینہ کے بازار سے کرسی لائی گئی۔ راوی کہتا ہے کہ اس کرسی کے پائے سیاہ تھے غالباً لوہے کے تھے مصلے کے قریب رکھی گئی۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اسی پر بیٹھ کر جوابات دیئے یہ فرمایا اور پھر خطبہ شروع فرما کر حضرت نے وعظ کیا' احقر ندامت سے پسینہ پسینہ ہوگیا۔

قادیانی مختار نے کہا کہ ''تحذیر الناس'' میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے بھی بعد خاتم النبیین نبی کا آنا تجویز کیا ہے۔

فرمایا: جج صاحب لکھئے ! حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے اپنے الہامی مضمون میں نبی کریم ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کے متعلق دلائل و براہین ساطعہ بیان فرمائے ہیں اور اکثر عبداللہ بن عباسؓ کی علمی توجیہات فرمائی ہیں۔ ان لوگوں پر حیرت ہے جو ''تحذیر الناس'' کو بغور و بالاستیعاب دیکھتے نہیں۔ اسی رسالہ میں جابجا نبی کریم ﷺ کا خاتم النبیین زمانی ہونا اور اس کا اجماعی عقیدہ ہونا اور اس پر ایمان ہونا ثابت فرمایا ہے۔ رسالہ کے ص ۱۰ کی عبارت' میں آپ کو لکھوانا چاہتا ہوں، حضرت مولانا فرماتے ہیں:

''سو اگر اطلاق اور عموم ہے تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے' ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بدلالۃ التزامی ضرور ثابت ہے۔ ادھر تصریحات نبوی مثل انت منی بمنزلہ ھارون من موسی الا انہ لا نبی بعدی او کما قال' جو بظاہر بطرز مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے۔ اس بات میں کافی ہے کیونکہ یہ مضمون درجہ تواتر کو پہنچ گیا ہے اور اس پر اجماع بھی منعقد ہوگیا ہے۔ گو یا الفاظ مذکور بسند تواتر منقول نہ ہوں۔ سو یہ عدم تواتر الفاظ باجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہوگا جیسا تواتر اعداد رکعات فرائض و وتر وغیرہ باوجود یہ کہ الفاظ حدیث مشعر تعداد رکعات متواتر

نہیں۔ جیسا کہ اس کا منکر کافر ہے ایسا ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا''۔

اسی رسالہ کے دوسرے صفحات میں بھی جا بجا حضور ﷺ کی خاتمیت زمانی کا اقرار فرمایا ہے۔ نیز مناظرہ عجیبہ جو صرف اسی موضوع پر ہے' نیز آب حیات' قاسم العلوم' انتصار الاسلام وغیرہا کتب مصنفہ حضرت نانوتویؒ دیکھنا چاہئے۔ حضرت مولانا مرحوم حضور ﷺ کے لئے تین طرح کی خاتمیت ثابت فرماتے ہیں۔ ایک بالذات یعنی مرتبہ حضور ﷺ کا خاتمیت ذاتی ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ وصف نبوت کے ساتھ موصوف بالذات ہیں اور انبیاء کرام علیہم السلام موصوف بالعرض اور آپ کے واسطے سے۔ جیسا کہ عالم اسباب میں موصوف بالنور بالذات آفتاب ہے۔ اس کے ذریعے سے تمام کواکب قمر وغیرہ اور دیگر اشیاء ارضیہ متصف بالنور' یہی حال وصف نبوت کا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ اس سے متصف بالذات ہیں اور اسی وجہ سے آنحضور ﷺ کو سب سے پہلے نبوت ملی۔ حدیث میں ہے: کنت نبیا وادم منجدل بین الماء والطین۔

اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام حضور ﷺ کے واسطے سے متصف بالنبوۃ ہوئے۔ حدیث میں ارشاد ہے:

''لو کان موسیٰ حیا لما وسعہ الا اتباعی'' ۔ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرے اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا''۔

پارہ نمبر ۳ کے آخری رکوع میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۔ (آل عمران ۸۱)

جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تمہیں کتاب وحکمت دوں پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو تمہارے پاس کی چیز کو سچ بتائے تو تمہارے لئے اس پر

ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا ضروری ہے۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ جیسا کہ اس امت کے رسول ہیں، نبی الانبیاء بھی ہیں، تمام انبیاء علیہم السلام کی جماعت کو ایک طرف رکھا گیا اور نبی کریم ﷺ کو ایک طرف اور سب سے حضور ﷺ پر ایمان لانے اور مدد کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا۔ آیت میں ثم جاءکم فرما کر تصریح فرما دی گئی کہ حضور ﷺ کا زمانہ ظہور سب سے آخر میں ہوگا ....

آیت میثاق در وے ثم ہست	ایں ہمہ از مقتضائے ختم ہست

ثم عربی زبان میں تراخی کے لئے آتا ہے۔ اسی واسطے علی فترۃ من الرسل الایۃ فرمایا۔ حدیث میں ہے: انا دعوۃ ابی ابراھیم۔ میں اپنے باپ حضرت ابراہیم کی دعا ہوں، تمام انبیاء علیہم السلام حضور ﷺ کی تشریف آوری کی بشارت دیتے آئے۔ چنانچہ ''توراۃ شریف'' ''انجیل شریف'' و دیگر صحف میں باوجود تحریف لفظی و معنوی ہو جانے کے اب بھی متعدد آیات موجود ہیں جو حضور ﷺ کی خاتمیت اور افضلیت کا پتہ دیتی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ تشریف لا کر اتباع شریعت محمدیہ کرنا اسی فضیلت اور خاتمیت کا عملی مظاہرہ ہوگا۔ لیلۃ المعراج میں انبیاء علیہم السلام کا صف بندی کر کے امام کا منتظر رہنا اور حضور ﷺ کا امامت کرنا بھی اسی کی طرف مشیر ہے کہ لیلۃ المعراج میں انبیاء علیہم السلام کا اجتماع حضور ﷺ کے ساتھ ہوا اور ابن حبیب عبداللہ ابن عباسؓ سے راوی ہیں کہ یہ آیت لیلۃ المعراج میں نازل ہوئی۔ (اتقان) اور انا خطیبھم اذا انصتوا اور احادیث شفاعت بھی اسی فضیلت محمدیہ کا اعلان کرتی ہیں۔

معلوم ہوا کہ حضور ﷺ پر نبوت کا اختتام ہوا اور پہلے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نہ کسی کا زندہ رہنا ضروری تھا تا کہ بطور نمائندہ سب کی جانب سے حضور ﷺ کے

دین کی نصرت کریں۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کا انتخاب ہوا' اس لئے کہ آپ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں اور سلسلہ اسحاقی اور اسماعیلی کو جوڑ دینا منظور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تین امور کا اعلان فرمایا:

۱۔ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ۔ (الصف ۵)

''اے بنی اسرائیل! میں فقط تمہاری طرف مبعوث ہو کر آیا ہوں''۔

۲۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ۔ (الصف ۵)

''مجھ سے پہلے کی کتاب توراۃ کی میں تصدیق کرنے والا ہوں''۔

۳۔ وَ مُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ۔ (الصف ۵)

''میں ایک عظیم الشان رسول برحق کی خوشخبری سنانے آیا ہوں جو میرے بعد مبعوث ہوں گے ان کا نام احمد ہے''۔

قرآن عزیز اعلان کرتا ہے کہ وہ رسول برحق جن کے متعلق عالم ارواح میں انبیاء علیہم السلام سے عہد و پیمان ہوا اور بشارات دی گئی تھیں، آ چکا۔

جاء الحق و صدق المرسلین۔

حدیث شریف میں ہے:

(۱) انی اولی الناس بعیسی بن مریم۔ الحدیث۔ مجھے زیادہ قرب ہے عیسیٰ علیہ السلام بہ نسبت تمام لوگوں کے اور بلا شبہ وہ نزول فرمائیں گے''۔

انبیاء بنی اسرائیل کے آخری نبی اولوالعزم کا خاتم النبیین علی الاطلاق کے دین کی نصرت کے لئے تشریف لانا اور شریعت محمدیہ پر عمل فرمانا، حضور ﷺ کے افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہونے کا عملی مظاہرہ ہے۔ فضیلت محمدیہ کو دنیا پر واشگاف کر دینا منظور ہے۔ آپ کا حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں تشریف لانا ایسا ہی ہے جیسے ایک نبی دوسرے نبی کے علاقہ میں چلا جائے۔ چنانچہ حضرت یعقوبؑ حضرت یوسف علیہ السلام کے علاقہ میں

تشریف لے گئے تھے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو نبی ہی ہوں گے لیکن بہ حیثیت حکما عدلاً تشریف آوری ہوگی۔ بطور مجتہد فرمانے کے تشریف آوری ہوگی۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قرب قیامت میں عیسائی اقوام کی مسلمانوں سے مڈ بھیڑ رہے گی۔ لہٰذا اہل کتاب کی اصلاح کے لئے تشریف لائیں گے۔ ثالث وہی ہوتا ہے جو ہر دو فریق کے نزدیک مسلم ہو۔ ہماری کتابیں "**عقیدة الاسلام**" "**تحیة الاسلام**" "**التصریح بما تواتر فی نزول المسیح**" اس بات میں دیکھنا چاہئے۔

دوم خاتمیت زمانی یعنی آپ کا زمانۂ نبوت اس عالم مشاہدہ میں تمام انبیاء علیہم السلام کے آخر میں ہے۔ آپ کے بعد کسی کو نبوت کی تفویض نہ ہوگی۔ ابی بن کعبؓ سے مرفوعاً روایت ہے:

بدلی بی الخلق و کنت اخرهم فی البعث' و اخرج جماعة عن الحسن عن ابی هریرة مرفوعاً کنت اوّل النبیین فی الخلق و اخرهم فی البعث. ("کذا فی روح المعانی" ص ۱۱ ج ۷)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنحضور ﷺ سے پہلے نبی بنائے جاچکے ہیں۔ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ اسلام کا اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے۔

مرزا غلام احمد نے اجماع کو حجت مانا ہے۔ چہ جائیکہ تمام اُمتِ محمدیہ کے تواتر سے ثابت شدہ عقیدہ (تریاق القلوب) حضرت نانوتویؒ نے تیسری خاتمیت مکانیہ ثابت فرمائی ہے یعنی وہ زمین جس میں نبی کریم ﷺ جلوہ افروز ہوئے۔ وہ تمام زمینوں میں بالاتر اور آخری ہے اور اس کے اوپر کوئی زمین نہیں' اس کو بدلائل ثابت فرمایا ہے۔

قادیانی مختار مقدمہ نے سوال کیا کہ امام مالکؒ سے منقول ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے قائل ہیں۔ احقر نے فرمایا کہ ابی کی شرح "مسلم شریف" نکالو چنانچہ ص

۲۲۶' ج ا مطبوعہ مصر سے ذیل کی عبارت پڑھ کر سنائی:

"**وفی العتبة قال مالک بینا الناس قیام یستمعون لاقامة الصلوٰة فتغاشهم غمامة فاذا عیسٰی قد نزل الخ**"۔

عتبہ میں ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا: "درآنحالیکہ لوگ کھڑے نماز کی اقامت سن رہے ہوں کہ اچانک ان کو ایک بادل ڈھانپ لے گا' یکا یک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے"۔

امام مالکؒ کا بھی وہی عقیدہ ہے جو ساری اُمتِ محمدیہ کا اجماعی اور متواترہ عقیدہ ہے۔ ہم نے تتبع کیا ہے کوئی تیس اکتیس صحابہؓ احادیث نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے راوی ہیں۔ تابعین کا تو احصا بھی مشکل ہے۔ امام ترمذیؒ نے پندرہ صحابہؓ گنوائے ہیں ہم نے مزید پندرہ (۱۵) کا اضافہ کیا۔ چنانچہ "مسند احمد" و "کنز العمال" و دیگر کتب حدیث کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں۔ ہمارا رسالہ "**التصریح بما تواتر فی نزول المسیح**" مطالعہ کیا جائے۔

قادیانی نے سوال کیا کہ علماء بریلوی' علماء دیوبند پر کفر کا فتویٰ دے رہے ہیں اور علماء دیوبند بریلوی پر۔

ارشاد فرمایا کہ جج صاحب! احقر بطور وکیل تمام جماعت دیوبند کی جانب سے گزارش کرتا ہے کہ حضرات دیوبند ان کی تکفیر نہیں کرتے۔ اہل سنت والجماعت اور مرزائی مذہب والوں میں قانون کا اختلاف ہے' علماء دیوبند اور علماء بریلوی میں واقعات کا اختلاف ہے' قانون کا نہیں۔ چنانچہ فقہاء حنفیہؒ نے تصریحات فرمائی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کلمۂ کفر کسی شبہ کی بناء پر کہتا ہے تو اس کی تکفیر نہ کی جائے گی۔ دیکھو "رد المختار" و "بحر الرائق"۔

(مضمون: مولانا محمد انوری از حیات انور ص ۳۳۲ تا ۳۴۶ مرتبہ سید محمد ازہر شاہ قیصر)

حضرت امام کشمیریؒ کی صاحبِ ''المنار'' علامہ رشید رضا کی دیوبند آمد پر تقریر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

الحمد للہ کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . اما بعد !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ !

آج کی اس تقریب کا پس منظر و پیش منظر حاضرین کے علم میں ہے، جیسا کہ معلوم ہے کہ ہمارے مہمان مکرم ''علامہ رشید رضا'' خوش قسمتی سے ہمارے درمیان تشریف رکھتے ہیں۔ آپ قاہرہ کی ممتاز شخصیت، عالم اسلام کی نمایاں ہستی ہیں اور آپ کی ذات گرامی سے جدید وقدیم تصورات کی تاریخ وابستہ ہے۔ آپ کی گوناگوں شخصیت اور مرقع علم ودانش کسی طویل تعارف کا محتاج نہیں اور وقت بھی مختصر ہے۔ اس لئے میں کسی طویل تمہید کے بغیر اس وقت کے مناسب کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے میں دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل وعقد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس وقیع اور پُر تپاک تقریب میں کچھ عرض کرنے کا حکم دیا جس کی تعمیل میں اپنے لئے سعادت باور کرتا ہوں۔

مہمان مکرم کی نجی گفتگو سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ دارالعلوم کے مسلک، علوم وفنون

میں اس کے امتیاز، اس کے خصوصی ذوق ومشرب سے چنداں واقف نہیں ہیں جس کی بنا پر ان کے لئے یہ حقیقت تقریباً مشتبہ ہے کہ فقہ حنفی کی حدیث سے مطابقت اور حدیث وقرآن کے سرچشموں سے اس فقہ کا استنباط واستخراج کس حد تک صحیح ہے، اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اسی موضوع کو اپنی گذارشات کا عنوان بنا کر کچھ عرض کروں۔

مولانائے محترم ! آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا یہ ملک اور سرزمین وطن یعنی ہندوستان ممالک اسلامیہ سے بہت دور واقع ہوا ہے۔ خصوصاً اسلام کے وطن اول (مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً) اور وطن ثانی (مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفاً) سے بُعد مسافت کی بنا پر اسلام کے شعائر اس ملک میں دھندلے اور دینی علوم کی شمع فروزاں ہونے کے بجائے یہاں دھیمی رفتار سے نور افگن تھی، الا ما شاء اللہ۔

اس لئے ہماری موجودہ اس جماعت نے جسے ''علمائے دیوبند'' کے نام سے شہرت حاصل ہے۔ ہندوستان میں اسلام اور اُمت مرحومہ کے لئے جو طریق کار ومنہاج متعین کیا اس میں یہ خصوصی حکمت ومصلحت پیش نظر رہی کہ یہاں صحیح ومخلصانہ خدمت کے لئے اسلام کے قدیم ہی زوایا ودوائر میں رہ کر کوئی موثر ومفید خدمت انجام دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اکابر نے پُرعزم انداز میں اپنا موقف متعین کیا اور اسی موقف پر گامزن ورواں دواں ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے دیوبند اور اکابر دیوبند کے باب میں اس نقطۂ نظر کو بقوۃ اپنانے کی ضرورت ہے کہ وہ کوئی تجدد پسند ادارہ نہیں اور نہ قدیم روایات کو شکست وریخت کرنا اس کے منصوبہ کا جزء ہے بلکہ وہ اسلام کو اس کی صحیح شکل وصورت اور حقیقی خدوخال میں نمایاں کرنے کی مبارک ومسعود خدمت کو اپنا دینی فریضہ یقین کرتے ہیں۔ بایں ہمہ اسلام جس حد تک لچک رکھتا ہے اور جس انداز پر مسائل وحوادث میں اس کی قیادت پیش کی جاسکتی ہے علمائے دیوبند اس توسع سے بھی گریز نہیں کرتے، گویا کہ قدامت کے ساتھ وسیع

المشربی، دینی اقدار پر تصلب کے ساتھ توسع ہمارا خصوصی ذوق وممتاز رجحان ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ ہم دینی مسائل واسلامی نقطۂ نظر میں ہندوستان میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم فاروقی دہلوی رحمہم اللہ سے ذہنی وعلمی روابط استوار کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے امام حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف عالم اسلام کے ہر گوشہ میں پہنچ چکیں اور ان کی مجتہدانہ بصیرت کے مرغزار سب کے لئے دعوت نظارہ ہیں لیکن پھر بھی امام ہمام کے بعض احوال وسوانح ایسے ہیں جو ہم نے اپنے ثقہ اکابر سے سنے اور جو شاہ صاحب کی عام سوانح میں موجود نہیں۔ ان سوانحی نشیب وفراز پر اطلاع کے بغیر شاہ صاحب کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے افکار ونظریات کے گوشے واضح نہیں ہوتے، اس لئے مقصد کو قریب تر کرنے کے لئے میں مجبور ہوں کہ شاہ صاحبؒ کی ابتداء وانتہاء پر کچھ عرض کروں۔

سوانحی خدوخال :

سوانحی خدوخال سے میری مراد یہ نہیں کہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے سن پیدائش یوم ولادت وجائے پیدائش کی غیر ضروری تفصیلات میں آپ کا وقت عزیز وقیمتی لمحات صرف کروں بلکہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی حیات طیبہ کے اس موڑ سے گفتگو کا آغاز کرتا ہوں، جہاں سے قدرت کے فیاض ہاتھوں نے انہیں امامت کے جلیل منصب کیلئے تراش وخراش کیا۔ وہ دور شاہ صاحبؒ کے حصول علم اور علمی مراحل میں تحقیق وژرف نگاہی کا میموں عہد ہے، انہوں نے ابتدائی علوم اپنے والد ماجد شاہ عبد الرحیم صاحبؒ سے حاصل کئے اور پھر جذبۂ زیارت وشوق تحصیل علوم کے حسین امتزاج میں حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔ سرزمین حرم پر شیخ ابو طاہر کردی علیہ الرحمۃ سے باقاعدہ حدیث کا درس لیا اور استفادہ کی جدوجہد میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا لیکن اس استفادہ میں بھی ان کی جلیل شخصیت اتنا نا

مستقبل کے آثار اس طرح ہویدا تھے کہ شیخ ابو طاہر فرماتے کہ :

"شاہ ولی اللہ مجھ سے حدیث کے الفاظ لیتے ہیں جبکہ مطالب ومعارف حدیث میں میں خود ان کا تلمیذ ہوں"۔

باکمال استاذ کے اس تاریخی مقولہ کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ فیاض حقیقی نے جو ذکاوت وذہانت کی وافر دولت ثقاہت اور دقیقہ سنجی کی متاع بے بہا حضرت شاہ ولی اللہؒ کو عنایت فرمائی تھی، اس کے نتیجہ میں وہ حدیث کی ایسی دل نشین توجیہ وتشریح پر کامیاب رسائی رکھتے تھے جو شارع علیہ السلام کا حقیقی مقصد ہوتا۔ دو سال کے قیام کے بعد شاہ صاحبؒ اپنے وطن ہندوستان لوٹ آئے۔

ہندوستان کی زبوں حالی اور نکبت وذلت کے تہ بہ تہ بادل :

یہ وقت تھا کہ ہندوستان ان وجوہ کی بنا پر جن کی جانب میں نے آغاز ہی میں متوجہ کیا تھا یعنی اسلام کے حقیقی سرچشموں سے بعد ودوری اس سرزمین پر اسلام کو عموماً اور سنت رسول اللہ ﷺ کو خاص طور پر پامال کئے ہوئے تھی۔ برائے نام مسلمان سلطنت کا ڈھانچہ بھی ٹوٹ رہا تھا اور ایک نئی تہذیب وتمدن ہندوستان کی جانب مسلسل بڑھ رہا تھا۔ اس آنے والی تہذیب سے اسلام کو جو متوقع خطرہ تھا، شاہ صاحبؒ کی دوررس نظر اور اس کے معلوم کرنے سے عاجز نہیں تھی۔ بدعات ومحدثات کے خول میں مسلمان پھنس گئے تھے، روایات وخرافات کے گھروندے میں الجھے ہوئے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی بصیرت ودانش وبینش کے نتیجہ میں یہی فیصلہ کیا کہ اس سرزمین پر ان کے سوا اور کوئی طریق کارسود مند وبار آور نہ ہوگا کہ سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو قائم کرتے ہوئے اسلام کی حقیقی شکل اور اس کے پائیدار نفوذ کے لئے راہیں ہموار کی جائیں۔ چنانچہ موصوف نے اصلاحی

اقدام شروع کیا اور بگڑے ہوئے معاشرہ کو روبہ اصلاح لانے کے لئے اس جدوجہد میں مصروف ہوگئے، جو خاصانِ خدا کا خصوصی حصہ ہے۔ اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کے سینے کی وسعتوں میں ایسی روحانی روشنی موجود تھی، جس کے اُجالے میں وہ مستقبل کو پڑھ لیتے اور جدوجہد کے آغاز سے اس کے انجام تک پہنچنا ان کے لئے آسان تھا۔ ان کی فراست ایمانی نے بھل کر بتا دیا تھا کہ اب ہندوستان کی زمین پر حق و باطل کا ایک معرکہ شروع ہوا چاہتا ہے جس میں حق کی حمایت و نصرت کے لئے محدود نہیں بلکہ وسیع اور جہد مسلسل کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ امام دہلویؒ نے جن خطوط پر کام کیا، اس کی ایک مختصر تفصیل یہ ہے۔

تجدیدی کوششوں کا آغاز اور اس کے دوائر :

حضرت شاہ صاحبؒ قرآنی ہدایت کو عام کرنے اور عوام تک پہنچانے کے لئے منصوبہ بند پروگرام کی جانب متوجہ ہوئے۔ آپ جانتے تھے کہ اسلام کے اوّلیں و حقیقی ماخذ یعنی قرآن کی تعلیمات و معارف سے براہ راست واقفیت کے بغیر ہندوستانی مسلمان جس تہ بہ تہ گمراہی میں اُلجھا ہوا ہے، اس سے باہر نہیں آ سکتا۔ اس لئے سب سے پہلے آپ نے اس وقت کی رائج زبان فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے اس ترجمہ کو اسرائیلیات و خرافات سے پاک وصاف رکھا اور اس طرح توحید کے مسئلہ کے لئے آپؒ نے تخم کاری کی۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کے دوسرے سرچشمہ حدیثی مضامین سے بلاواسطہ شناسائی کے لئے حدیث کی مشہور کتاب "موطا امام مالک" کی شرح فارسی زبان میں "المسوّی" کے نام سے تحریر فرمائی۔ اس شرح میں فقہاء حدیث کے طریقہ پر حدیث و آثار کی شرح بہترین انداز میں آ گئی اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ تحقیق مناط اور تخریج مناط اور تنقیح مناط کی جانب شاہ صاحبؒ متوجہ رہے۔

مہمانِ مکرم ! ابھی میں نے آپ کے سامنے تین اصطلاحی الفاظ استعمال کئے، جن کی معرفت آپ کو بخوبی حاصل ہے لیکن عام افادہ کے لئے ان اصطلاحات پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں، جیسا کہ معلوم ہے کہ :

تحقیق مناط :

مطلب یہ ہے کہ شارع علیہ السلام سے کسی جزئی صورت میں کوئی حکم صادر ہوا، پھر یہی حکم اس نوع کی ساری جزئیات میں ثابت کر دیا جائے۔ مثلاً شریعت نے حالتِ احرام اور حدودِ حرم میں شکار کی ممانعت کی ہے اور پھر بطور سزا و جزا حالتِ احرام میں شکار کرنے والے کے لئے قیمت شکار کردہ جانور کی ادا کرنا ضروری ہے۔ اس قیمت کی تشخیص ہی تحقیق مناط ہے اور چونکہ اس کا تعلق فقہ کی اہم بنیاد قیاس سے نہیں ہے، اس لئے اس میں کسی اجتہاد کی بھی ضرورت نہیں اور یہ کام ہر شخص کر سکتا ہے، بشرطیکہ تجربہ، شعور رکھتا ہو۔

تخریج مناط :

یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے کسی سلسلہ میں کوئی حکم دیا اور اس حکم کی علت بیان نہیں کی بلکہ نص میں بھی اس کی علت موجود نہیں۔ مزید برآں وہاں چند ایسے اوصاف بھی موجود ہیں جن میں سے ہر ایک علت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں مجتہد کو اپنا سرمایۂ فکر و نظر صرف کر کے کسی ایک وصف کو بطور علت متعین کرنا ہوگا۔ یہ بڑے غور و فکر اور بحتاط تحقیق و تدبر کا کام ہے، اس لئے عوام اس میں قطعاً شریک نہیں کئے جا سکتے۔ اسے اس طرح سمجھئے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ربوا" سے منع فرمایا لیکن اس حرمت کی کوئی علت نہیں بیان فرمائی۔ البتہ چند اوصاف علت بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ گویا کہ اوصاف یہ ہیں :

''قدر، وزن، کیل جنس، چیز کا قیمتی ہونا، شے کا ازقبیل غذا ہونا اور قابل ذخیرہ ہونا''۔

ظاہر ہے کہ جب یہ چند در چند اوصاف یکجا جمع ہوگئے، تو علماء کے لئے راہ کھلی ہوئی ہے کہ وہ اپنے ذوق ورجحان کے مطابق کسی ایک وصف کو حرمت کی علت قرار دیں۔ چنانچہ سود ہی کے مسئلہ میں امام اعظمؒ کے خیال میں حرمت کی علت ''قدر و جنس'' میں اتحاد ہے اور حضرت امام مالکؒ کی رائے میں ربوا کی حرمت کی علت اشیاء کا ازقبیل غذا اور قابل ذخیرہ ہونا ہے جبکہ امام شافعیؒ نے چیز کے قیمتی ہونے کو علت بتایا ہے، مگر عرض ہے کہ تخریج مناط مناط کی تین قسموں میں سب سے اہم اور بے حد دشوار ہے، اس میں ضروری غور وفکر اور جچے تلے تدبر وتحقیق کی قدم قدم پر ضرورت ہے اور یہ کام کوئی ماہر فن ہی انجام دے سکتا ہے۔

تنقیح مناط :

مناط کی تیسری قسم تنقیح مناط کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے کسی خاص واقعہ کے تحت کوئی حکم دیا اور اس سے مقصود کسی قاعدہ کلیہ کی تشکیل نہیں بلکہ کسی واقعہ کے تحت ہی وہ حکم جاری ہوا، اور یہ اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے، پھر بھی حکم کی علت معلوم نہیں ہوتی بلکہ یہاں چند در چند چیزیں جمع ہو جاتی ہیں، جن میں سے بعض علت ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور بعض نہیں۔ حالانکہ یہ بھی بادی النظر میں علل معلوم ہوتی ہیں۔ اس مرحلہ میں علت کا تعین وتشخیص فقہاء کا کام ہے اور ایسی تنقیح کو ''تنقیح مناط'' کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ روایت ہے کہ ایک صاحب جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں تباہ وبرباد ہوگیا، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کیوں؟ کیا بات پیش آئی؟ بولا کہ رمضان کے مہینہ اور روزہ کی حالت

میں نے اپنی بیوی سے ہم بستری کرلی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ غلام آزاد کر سکتے ہو؟ جواب تھا نہیں، تو کیا پھر ساٹھ (۶۰) مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ جی یہ بھی نہیں، تو پھر اچھا متواتر دو (۲) مہینے کے روزے رکھ سکو گے؟ حضور یہ تو بہت مشکل ہے۔

اس صورت میں امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے خیال میں کفارہ واجب ہے اور اس کے وجوب کا مناط وعلت رمضان اور روزے کی حالت میں عمداً روزہ افطار کرنا ہے، خواہ وہ روزہ کے منافی فعل ہم بستری ہو جیسا کہ اس واقعہ میں یہی پیش آیا یا کھانا پینا ہو، یہ دونوں حضرات منافی صوم کے اقدام کے لئے عمداً کی قید کا اضافہ کرتے ہیں اور ماہ رمضان کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بستری اتفاقاً اس واقعہ میں پیش آگئی، ورنہ تو منافی صوم فعل کا ارتکاب وجوب کفارہ کا اصل سبب ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے خیال میں کفارہ کا موجب ومناط صرف جماع ہی ہے۔ پس اگر جماع کے نتیجہ میں افطار ہوا تو کفارہ واجب ہوگا۔ اکل وشرب کی صورت میں وجوب کفارہ نہیں۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے پاس ایک اور حدیث ابو ہریرہؓ ہی کی اپنے نقطۂ نظر کی مؤید ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص رمضان میں کسی شرعی رخصت کے بغیر روزہ توڑ دے تو بعد میں اگرچہ عمر بھر روزہ رکھتا ہو پھر بھی اس کوتاہی کی تلافی ہرگز نہ ہوگی اور یہ دونوں حضرات اس حدیث میں لفظ ''افطار'' سے عمداً کھانا پینا اور ان کے ذریعہ سے روزہ توڑنا مراد لیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ قصداً خورد ونوش کے نتیجے میں روزہ کا توڑنا اور پھر عمر بھر روزہ رکھنا مفید نہیں۔ اس لئے اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں ہوگا۔

غرضیکہ تنقیح مناط اور تخریج مناط یہی دونوں مجتہدین ائمہ کی اصل جولانگاہ ہے اور اسی میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ کوئی اپنے اجتہاد سے کسی چیز کو علت بتاتا ہے اور دوسرا کسی دوسری چیز کو۔ اس کی ایک مثال وہ حدیث بھی ہے جس میں آپ ﷺ

نے ارشاد فرمایا: مفتاح الصلوة الطهور و تحريمها التكبير و تحليلها التسليم۔
اس کے پیش نظر اکثر ائمہ نے صیغۂ تکبیر "الله اكبر" اور صیغۂ تسلیم "السلام عليكم و رحمة الله" کو رکن نماز قرار دیا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کے یہاں مناط حکم یہ ہے کہ تکبیر سے مخصوص اللہ اکبر کا صیغہ مراد نہیں بلکہ وہ ہر ذکر اللہ ہے جس میں تعظیم اور خدا کی کبریائی کا مفہوم موجود ہو اور تسلیم سے مراد یہ ہے کہ مصلی اپنے ارادے و اختیار سے نماز کو ختم کرے، گویا کہ وہ تسلیم کر خروج عن الصلاۃ کے ہم معنی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام اعظمؒ نے ان دونوں چیزوں یعنی الفاظ، حامل تعظیم اور ارادے کے ساتھ نماز کو ختم کر دینے کو فرض اور رکن صلاۃ ٹھہرایا ہے لیکن چونکہ جناب رسول کریم ﷺ سے عملاً تکبیر بشکل اللہ اکبر اور تسلیم بصورت السلام علیکم ورحمۃ اللہ، ہمیشہ ثابت ہے۔ اس لئے امام ابوحنیفہؒ ان دونوں کو واجب صلاۃ کہتے ہیں۔ حافظ ابن ہمامؒ مصنف "الفتح القدیر" نے اللہ اکبر کو واجب بتایا ہے اور مشہور یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔ ان دونوں میں ذکر مشعر تعظیم اور خروج بصنع المصلی اس طرح موجود ہے، جس طرح کوئی کلی کسی جزئی کے تحت میں موجود ہو۔ پس یہ دونوں فرض ہوں گے۔

مہمان مکرم! میں تفصیل سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے مقصد کی وضاحت اختصار سے کر رہا ہوں، ورنہ تو ایسی مثالیں اور بھی پیش کیا جا سکتی تھیں، اب میں پھر اسی تذکرہ کی جانب رجوع کرتا ہوں یعنی حضرت شاہ ولی اللہ الدھلویؒ کے مجددانہ کارناموں کی تفصیل:

میں عرض کر رہا تھا کہ شاہ صاحبؒ نے موطا کی شرح "المسوّیٰ" میں ان تنقیحات کے تینوں شعبوں کی رعایت کی ہے اور وہ ایسے فقہ کو مختار قرار دے رہے ہیں، جس میں جامعیت موجود ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی دو معرکۃ آرا تصانیف "الانصاف فی بیان

سبب الاختلاف" اور "عقد الجيد في مسائل الاجتهاد و التقليد" میں یہ بات محققانہ انداز میں تحریر فرمائی ہے کہ مجتہد فیہ مسائل میں حق کسی ایک امام کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ متعدد ہو کر ہر امام کے لئے ممکن ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ائمہ اربعہ کا بھی یہی نقطہ نظر تھا، وہ خود کو حق کا اجارہ دار قرار دے کر دوسرے مجتہد کو باطل پر قائم نہیں سمجھتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ:

"میں خود بھی اسی نقطۂ نظر کا حامل ہوں"۔ یہاں یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ مجتہد فیہ مسائل سے میری کیا مراد ہے؟ تو یاد رکھئے اجتہادی مسائل وہ ہوتے ہیں جن میں کتاب اللہ یا سنت (رسول اللہ ﷺ) متواترہ سے کوئی حتمی بات ثابت نہ ہو۔ ایسے ہی مسائل میں حق کا تعدد کیا جا سکتا ہے ورا گر کسی معاملہ میں کوئی قطعی دلیل موجود ہے تو نہ وہاں کوئی مجتہد اجتہاد کرے اور نہ اسے اجتہادی مسئلہ کہا جا سکتا ہے، وہاں حق صرف ایک ہی ہوگا اور حق وہی ہوگا جو اس دلیل قطعی کے مطابق ہو۔ پس اسے خوب ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جو اس حق کی موافقت و تائید کرے وہی حق گو و حق پسند ہے اور جو اس سے مخالفت رکھتا ہو، اسے یقیناً حق کا مخالف کہا جائے گا"۔

شاہ صاحبؒ نے اس کے ساتھ تشریح و عقائد اسلام کے حکم و مصالح کے بارے میں بھی ایسی تصانیف فرمائیں جو راہوں کی شمع اور دشوار گھاٹیوں میں فانوس ہیں۔ ان عنوانات پر ان کی شہرۂ آفاق تالیف "حجۃ اللہ البالغہ" اور "تفہیمات الٰہیہ" نیز "خیر کثیر" مشہور ہیں۔

اولاد و احفاد اور ولی اللٰہی شاہکار کی حفاظت و صیانت:

خدا کا شکر ہے کہ الامام الدھلوی کے یہ مخصوص افکار و نظریات اور ان کی مجددانہ کاوشیں ان ہی پر ختم نہ ہونے پائیں بلکہ ان کی اولاد و احفاد میں اس طریق کار پر مسلسل پیش

رفت ہوتی رہی۔ چنانچہ ان کے سب سے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبد العزیزؒ، دوسرے صاحبزادے حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین مرحوم نے قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر ملک میں عام کیں اور حضرت شاہ محمد اسحاق، شاہ عبد الغنی، شاہ محمد اسماعیل علیہم الرحمہ نے نہ صرف حدیث و عقائد کی درستگی کا اہتمام کیا بلکہ یہ حضرات استخلاصِ وطن اور اعلاءِ کلمۃ الحق کے لئے جلی و خفی کوششیں بھی کرتے رہے بلکہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے تو بدعات و محدثات کے خلاف زبردست جدوجہد کی اور بعض معرکۃ الآرا تصانیف ان کے علم زیرِ قلم سے تیار ہو کر ایمانیات کے سلسلہ میں مفید تر ثابت ہوئیں اور موصوف نے بالاکوٹ میں سکھوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ شاہ محمد اسحاق درسِ حدیث میں ایسے یگانۂ روزگار عالم تھے کہ اطراف ملک سے طلباء کا ان کی جانب ہجوم رہتا۔ غرضیکہ یہ خانوادہ علم و عمل کا مرقع، دین و دانش کا روشن مینار، بدعات کے لئے شمشیرِ بے نیام اور سنتِ مصطفوی ﷺ کے احیاء کے لئے کشادہ محراب تھا۔

دیوبند کا مکتبۂ فکر :

یوں تو یہی خاندانِ ولی اللہی دیوبندی مکتبِ فکر کا امام و سربراہ ہے، پھر بھی شاہ محمد اسحاقؒ کے خصوصی شاگرد حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مجددی مہاجر مدنیؒ اپنے استاذ کے بعد مسند آرائے درسِ حدیث ہوئے۔ طلباءِ حدیث نے ان سے ایسا استفادہ کیا جس کے آثار قیامت تک باقی رہیں گے۔ حضرت شاہ عبد الغنیؒ آخر میں مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کر گئے اور وہاں بھی بلادِ عرب کے طلباء ان سے حدیث کی سند لیتے رہے۔ ان ہی حضرت شاہ عبد الغنیؒ کے خصوصی تلامذہ میں ہمارے دار العلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ ہیں۔ بانیٔ دار العلوم نے بخاری

شریف کا حاشیہ جو ان کے استاذ حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کا شروع کیا ہوا تھا، مکمل فرمایا، اور دینی علوم و معارف پر اہم کتابیں تصنیف کرنے کے ساتھ مادہ پرست دہریہ اور اسلام خلاف فرقوں کی تردید میں مسلسل تصانیف کے ساتھ جابجا مناظرے بھی کئے اور اس دار العلوم کو ایک ایسے تخیل کے تحت قائم فرمایا جس سے ان کے دینی فکر اور اعلاءِ کلمۃ الحق و اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا مخلصانہ جذبہ ظاہر ہے۔ میں نے موصوف کے مناقب و فضائل میں کچھ قصائد کہے ہیں جس میں سے ایک قصیدہ پیش خدمت کرنا مناسب ہوگا جس کا پہلا شعر یہ ہے ....

قفا یا صاحبی علی الدیار   فمن داب الشجی ھو ازدیار

یہ دونوں حضرات یعنی حضرت نانوتویؒ و حضرت گنگوہیؒ رفیقِ درس اور فکر و نظر میں ایک دوسرے کے معاون تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کو خدائے تعالیٰ نے منفرد تفقہ عنایت فرمایا تھا جس کی بنا پر انہیں بلاتکلف ''فقیہ مجتہد'' کہا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی وہ بدعات و محدثات کے خلاف شمشیرِ برہنہ تھے۔ مسائل و حوادث میں ان کے فتاویٰ ملک میں قبولِ عام رکھتے، جن میں ان کے تفقہ اور بصیرت کے جوہر نمایاں ہیں۔ پس کہا جا سکتا ہے اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ حضرت گنگوہیؒ فروع و جزئیاتِ فقہیہ میں ہمارے امام اور حضرت نانوتویؒ اُصول و عقائد میں جماعت کے سربراہ ہیں۔ ان دونوں نے دیوبندی علوم کو ایسا منقح و روشن کیا کہ اب کوئی گوشہ مخفی نہیں رہا۔

علامہ جلیل :

آپ کو معلوم ہے کہ فرنگی شاطر نے اپنی مخصوص و روایتی دسیسہ کاریوں سے کام لے کر جب ہندوستان میں اپنی حکومت کے دائرے وسیع تر کر دئے اور مسلمانوں کی

بادشاہت ختم ہوگئی تو عیسائی مشنری نے ہندوستان میں عیسائیت و تثلیث کی تبلیغ کے لئے منصوبہ بند کام شروع کیا۔ دوسری جانب مسلمانوں میں تفرقہ اندازی کرتے ہوئے بعض مذموم و اسلام خلاف نظریات کو نام نہاد مسلمانوں ہی کے ذریعہ بروئے کار لانے کی بدترین کوشش کی۔ یہی وقت تھا کہ ان دونوں حضرات نے ہندوستان میں اسلام کے تحفظ اور اسلامی تعلیمات کی نشاۃ ثانیہ کے لئے دارالعلوم دیوبند کو قائم کیا۔ اس دارالعلوم نے نہ صرف اسلامی تعلیمات کو عام کیا بلکہ یہ انگریز کی دسیسہ کاریوں کے خلاف ایسا ہی معسکر تھا جو جاں سپار و فدا کار مجاہدین اسلام کو برآمد کر کے خدمت کے ہر محاذ پر روانہ کر رہا تھا۔ آج ہندوستان میں جہاں کہیں آپ کو تعلیمات اسلام کے چراغ روشن نظر آتے ہیں، وہ اسی مدرسہ کا فیض اور یہیں سے روشن کئے ہوئے چراغ ہیں۔ دارالعلوم کی خدمات اور اس کا دائرہ کار اس قدر وسیع ہے کہ اس مختصر وقت میں میں تفصیلات بیان کرنے سے عاجز ہوں۔

طریق تعلیم اور اغراض و مقاصد :

تاہم ضروری ہے کہ میں اس عظیم درسگاہ کے کچھ بنیادی مقاصد آپ کے سامنے پیش کروں تاکہ مدرسہ کے حدود و مقاصد آپ کے لئے واضح ہوں، تو لیجئے! ہمارا اصل مقصد حدیث اور فقہ الحدیث کی تعلیم و تدریس ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کچھ دوسرے علوم بھی مبادیات کی حیثیت سے پڑھائے جاتے ہیں لیکن ان کی تعلیم باندازۂ ضرورت ہی ہے۔ تا آنکہ ہماری جماعت کے دوسرے امام حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے تو اپنی سربراہی و سیادت کے دور میں کچھ سال ایسے بھی گزارے، جن میں فلسفہ و منطق کی تعلیم اور اس کی ابتدائی کتابوں کی تدریس متروک قرار دی تھی اور پھر یہ سلسلہ ایک عرصہ تک رکا رہا۔ گویا وہ علوم آلیہ میں بھی اُلجھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کی منزل علوم عالیہ

تھے۔ یعنی وہی حدیث وفقہ الحدیث، حدیث وفقہ الحدیث کی تعلیم میں ہمارا طریق کار متوازن، نپا تلا ہے، اسے یوں سمجھئے کہ مسائل فقہیہ کے استخراج و استنباط کے بارے میں ائمہ اربعہ کے چار مشہور اصول ہیں۔

۱۔ امام مالک علیہ الرحمہ : اہل مدینہ کی اقتداء اور اتباع کو بنیاد بناتے ہیں تا آنکہ مدنی تعامل ان کے یہاں حدیث مرفوع پر بھی ترجیح رکھتا ہے۔

۲۔ امام شافعی علیہ الرحمہ : کسی باب میں صحیح ترین حدیث (اصح مافی الباب) کو لے کر اس مسئلہ سے متعلق باقی روایات کو تاویلاً اپنی منتخب حدیث کے موافق کرتے ہیں یا ان احادیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔

۳۔ امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ : اصح، صحیح، حسن بلکہ ضعیف (جبکہ اس کا ضعف معمولی ہو) سب کو معمول بہا بنانے کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہر حدیث کا مدلول و مضمون قابل عمل ہے، اسی بنیاد پر انہوں نے اپنا مشہور مسند مرتب کیا ہے۔

۴۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ : تمام اقسام حدیث کو جمع کرتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے مضمون کو قانون کلی ہونے کی بنا پر شرعی قانون کی حیثیت دیتے ہوئے دوسری روایات کی مناسب توجیہ کرتے ہیں اور ہر حدیث کے لئے کوئی برجستہ محل تلاش کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں تاویلات احادیث زیادہ ہیں جبکہ شوافع کے یہاں رُواۃ پر جرح و تنقید کی کثرت ہے۔

امام شافعیؒ پہلے وہ امام ہیں جنہوں نے مرسل حدیث کو حجت تسلیم نہیں کیا، البتہ اگر مرسل حدیث کے مضمون کی تائید دوسری احادیث سے ہو تو پھر وہ مرسل کو تسلیم کرتے ہیں۔

ائمہ حدیث اور ان کے نقاط نظر :

الضعیف الجلیل : آپ جانتے ہیں کہ ائمہ حدیث نے بھی فقہاء کے اسی اصول وضابطے کے تحت رہ کر اپنے مجموعے تیار کئے ہیں۔ چنانچہ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے امام مالکؒ وشافعیؒ کے طرز کو ترجیح دے کر ان دونوں کے اصول کو مرکب کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی جامع میں اصح مافی الباب حدیث کا ذکر کرتے ہوئے اس کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں کہ اس حدیث کو سلف کے تعامل کی تائید حاصل ہو۔ امام ہمامؒ نے اس کی رعایت کی ہے کہ کوئی ایسی حدیث بخاری میں نہ آنے پائے جو کسی دوسری حدیث کے معارض ہو، بلکہ انہیں اپنے پسندیدہ اصول کی رعایت اس حد تک ملحوظ رہی کہ صلاۃ کسوف کے بارے میں صرف اسی روایت کو انہوں نے ذکر کیا جس میں ہر رکعت میں دو رکوع کا تذکرہ ہے۔ حدیث کے دوسرے مشہور امام یعنی مسلم بن حجاج القشیری کا زیادہ زور رواۃ کی ثقاہت پر ہے۔ چنانچہ انہوں نے صلاۃ کسوف کے سلسلہ میں اس روایت کو لیا جس میں ایک رکعت میں تین یا چار رکوع کا ذکر آرہا ہے اور تو اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر موقوف اس روایت کو بھی ذکر کرنے سے گریز نہیں کر رہے ہیں جس میں ایک ہی رکعت میں پانچ رکوع کا تذکرہ آرہا ہے۔ غرضیکہ امام بخاریؒ صلاۃ کسوف کے بارے میں موجود جملہ روایتوں سے اصح حدیث کا انتخاب کر رہے ہیں اور امام مسلمؒ اپنے دائرۂ کار میں محدود رہتے ہوئے بہت سی روایات کی تخریج کر رہے ہیں۔

اکابر دار العلوم کی وسیع المشربی :

ہمارے مشائخ یعنی اکابر دار العلوم نے ہر گوشہ میں اعتدال کو اپنایا ہے، وہ تشدد سے بھی محفوظ رہے اور سہولت پسندی بھی ان کے یہاں نہیں۔ ان کا خاص ذوق وشوق

متعارض احادیث میں یہ رہا کہ کسی حدیث کو ترک نہ کیا جائے۔ اس مبارک ومسعود مقصد کے لئے خدا تعالیٰ نے انہیں ایسے فہم اور توجیہی ذہن سے سرفراز فرمایا کہ وہ ہر حدیث کی قابل قبول اور دلنشیں توجیہ پر مضبوط قدرت کے مالک ہیں، بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ جو منصف ومعقولیت پسند فرد ان کی کی ہوئی توجیہات کو نظر انصاف دیکھے گا تو اس کی گہرائی وگیرائی اور دلنشیں ہونے کی داد دیے بغیر نہیں رہے گا۔ اپنے اس مقصد کو بعض مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ حدیث قلتین کا مسئلہ اختلافی مسائل میں ہے۔ حضرت امام شافعیؒ اور ان کا مکتبِ فکر قلتین کے مسئلہ میں منفرد رائے رکھتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اکابر دار العلوم کی مقبول توجیہ کی طرف آپ کو متوجہ کروں، پہلے اس باب کی متعارض روایات پر توجہ دلاتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یزید بن زریع، کامل بن طلحہ، ابراہیم الحجاج، ہدیہ بن خالد، وکیع اور یحییٰ بن معین نے اس روایت کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے :

اذا بلغ الماء قلتین او ثلث لم یحمل الخبث۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ”قلتین“ اور ”ثلث“ کے درمیان ”او“ تنویع کے لئے ہے۔ اس لئے یہ ایک اندازہ ہوگا، اسے شرعی حد بندی نہیں کہا جا سکتا اور مسئلہ کا فیصلہ اس پر ہوگا کہ ایک جانب کی نجاست دوسری جانب تک مؤثر ہے یا نہیں؟ بلاشبہ اگر روایت میں ”او“ نہ ہوتا تو مذکورہ بالا حدیث کو بے تکلف تحدید شرعی قرار دیا جا سکتا تھا۔ اسی لئے ابوحنیفہؒ اور ان کے صاحبینؒ نے مسئلہ مذکورہ میں قول فیصل نجاست کی تاثیر وعدم تاثیر کو کہا ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن ہمامؒ اور علامہ ابن نجیمؒ کی وضاحت ہے۔ حنفیہ کے اس نقطۂ نظر نتیجہ میں وہ احادیث تعارض سے محفوظ ہو گئیں جو قلتین والی حدیث سے متصادم نظر آتی ہیں یعنی حدیث ”النھی عن البول فی الماء الراکد“ اور حدیث ”النھی عن ادخال الید فی

الاناء" اور حدیث "ولوغ الکلب فی الاناء"۔

صاف نظر آرہا ہے کہ احناف کی توجیہ نے ان مختلف روایات میں تعارض وتزاحم کو کس کامیابی سے ختم کر دیا۔

ایک دوسری مثال مزید وضاحت کے لئے پیش کرتا ہوں۔ وہی اختلافی مسئلہ "قرأۃ خلف الامام" کا معلوم ہے کہ حضرات احنافؒ نے امام کی اقتداء میں سورۂ فاتحہ مقتدی کے نہ پڑھنے کی دلیل اس آیت کو بنایا ہے "واذا قرئ القران فاستمعوا لہ و انصتوا لعلکم ترحمون"۔ نیز یہ حدیث "اذا قرئ فانصتوا" اور مزید یہ حدیث "من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ"۔ تو انہوں نے اس سے بظاہر متعارض روایات مثلاً حدیث "لا تفعلوا الا بام القران فانہ لاصلوۃ لمن لم یقرأبہا" کی تاویل وتوجیہ کی۔ یہ عرض کرنا بھی مناسب ہوگا کہ مذکورہ بالا آیت کے شان نزول کے بارے میں جب کوئی صحیح روایت نہیں تو لازماً اس کے الفاظ میں عموم کا اعتبار رہے گا۔

امام بیہقیؒ نے کتاب القرأۃ میں احمد بن حنبلؒ سے روایت کی ہے کہ معتمد علماء کا اجماع ہے کہ یہ آیت "قرأۃ فی الصلوۃ" کے بارے میں ہے، یہی احمد بن حنبلؒ "اذا قرا فانصتوا" والی حدیث کو صحیح قرار دے رہے ہیں اور ابوبکر بن الاثرم نے بھی اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔ امام مسلم نے باب التشہد میں ابوموسیٰ اشعری کی روایت ذکر کی اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کا حوالہ دیا بلکہ ابن خزیمہؒ، ابن طبریؒ، حافظ ابن عبدالبرؒ، ابن حزم اندلسیؒ اس روایت کی تصحیح کر رہے ہیں اور تو اور حافظ ذکی الدین عبدالعظیم المنذریؒ اور یادش بخیر۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے تو دیکھا آپ نے کہ سند کی حیثیت سے اس حدیث کی قوت اور ترجیح کا کیا پایہ ہے۔ دوسری طرف تعامل سلف کے لحاظ سے اگر اس حدیث پر نظر ڈالئے تو صحابہ کی ایک جماعت مالکؒ، احمدؒ اور ابوحنیفہؒ اس

حدیث پر عمل پیرا ہیں اور جب کسی حدیث کے راوی ثقہ ومعتمد ہوں اور سلف صالحین کا تعامل بھی اس کا مؤید ہو تو وہ حدیث صحیح ہوگی، بلکہ کوئی رد وقدح یا جرح وتنقید اس حدیث کی صحت کو مجروح نہیں کرتی۔ اب دوسری حدیث "من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ" کو بھی لیجئے۔ حافظ ابن ہمامؒ نے احمد بن منیعؒ کے حوالہ سے اس حدیث کی تصحیح نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند شیخین کی شرائط کے مطابق ہے اور خود میں بھی آج تک کسی ایسی علت پر مطلع نہیں ہوا جو اس حدیث کے لئے قادح ہو۔ اس کی سند یہ ہے:

"اخبرنا اسحاق بن یوسف الازرق قال حدثنا سفیان وشریک عن موسیٰ بن ابی عائشۃ عن عبداللہ بن شداد عن جابر بن عبداللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ"۔ بلکہ ترمذی کے یہاں ایک موقوف روایت اور دوسرے محدثین کے یہاں ایک مرسل روایت اس روایت کی خوب مساعدت وتائید کرتی ہے۔ اس لئے اس حدیث کو بھی صحیح ماننا ہوگا۔

جب یہ بحث مختصر آپ کے سامنے آگئی تو اب اکابر دارالعلوم کی توجیہ ومعارض روایات میں ان کی فرحت انگیز تاویل کو سنئے۔

حضرت گنگوہیؒ نے جن کے متعلق میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ وہ فقہی جزئیات میں ہمارے مسلّم پیشوا ہیں، حضرت عبادہ بن صامتؓ کی اس روایت میں جو محمد بن اسحاق سے مروی ہے اور جس کا سیاق یہ ہے کہ "لعلکم تقرأون خلف امامکم" اور اس کے جواب میں صحابۂ کرام کا ارشاد "جی ہاں"۔ اور پھر اس پر آپ ﷺ کا یہ ارشاد "فلا تفعلوا" حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یہ دلیل اباحت ہے کہ دلیل وجوب۔ معلوم ہوا کہ حضرات صحابہؓ آنحضور ﷺ کی اجازت کے بغیر قرأت کرتے تھے۔ اسی لئے تو آپ کو دریافت کرنے کی ضرورت پیش آئی اور جب انہوں نے نعم سے جواب دیا تو آپ نے "فلا تفعلوا الا بام

القرآن" فرمایا۔

چونکہ یہ سورۂ فاتحہ قرآن مجید کی ایک متعین اور خصوصی سورۃ ہے جبکہ دوسری سورتیں اس طرح متعین نہیں۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سورۂ فاتحہ کا تذکرہ فرمایا۔ اس کا تمام تر تعلق صرف اس سورۃ کی خصوصیت کی بنا پر ہے اور معلوم ہے کہ یہی وہ سورۃ ہے، جس کے نہ پڑھنے سے نہ تو امام کی نماز ہوگی جبکہ وہ امامت کر رہا ہو اور نہ منفرد کی جبکہ وہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو۔ رہا مقتدی تو اس کے حق میں سورۂ فاتحہ کی قرآۃ کا معاملہ بجز مباح ہونے کے اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اباحت و کراہت کا مسئلہ خود احناف کے یہاں بھی اختلافی مسائل میں ہے، اگرچہ اس پر تمام احناف متفق ہیں کہ قرآۃ سورۂ فاتحہ مقتدی پر واجب نہیں۔ تاہم بعض اس کی قرأت کو بحالت اقتداء مباح کہتے ہیں اور جبکہ بعض اذا قری القرآن والی آیت کے پیش نظر ممنوع۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ کی اس توجیہ سے تمام معارض روایات ایک دوسرے کے موافق ہو گئیں اور ان میں کوئی مخالفت و تزاحم نہ رہا اور اختلافی مسئلہ لیجئے یعنی رفع یدین اور آمین بالجہر۔ اس میں بھی علماء دیوبند کا ذوق یہ ہے کہ "رفع یدین" اور "آمین بالجہر" رسول اکرم ﷺ اور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے اور ترک رفع اور اخفاء بالتامین بھی ثبوت کے درجہ میں ہے جیسا کہ امام ابوداؤد کے یہاں صحیح سند سے موجود حدیث میں ہے بلکہ یہی نہیں، ترک رفع حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی روایات صحیحہ سے بھی محقق ہے اور ترک جہراً آمین کو صحابہ کرام کے جم غفیر اور سلف صالحین کے تعامل سے ثابت ہی ماننا ہوگا۔ نتیجۃً رفع و ترک، آمین بالجہر و آمین سراً ہر دو سنت ہی کے ذیل میں آتے ہیں گفتگو جو کچھ ہوگی وہ ترجیح ہی کے باب میں رہے گی تو احناف رفع یدین کے ترک اور آمین بالسر کے ترجیح کے قائل ہیں۔

علامہ جلیل ! میری اس مختصر گذارش و تفصیل سے آپ کو محسوس ہوا ہوگا کہ علماء دیوبند کا طریق کار تشدد و افراط و تفریط سے کس درجہ محفوظ ہے، وہ دوسرے ائمہ کے مذاہب کو کلیۃً باطل نہیں کہتے بلکہ حق و صواب ان کے لئے بھی محفوظ مانتے ہیں۔ یہی وہ اعتدال ہے جس کی وجہ سے دیوبندیت ایک محفوظ، معتدل مسلک بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔

اس وقت ہندوستان میں اسناد حدیث کا مدار حضرت نانوتویؒ بانی دارالعلوم قدس سرہ کے فخر روزگار شاگرد حضرت شیخ الہندؒ پر ہے۔ یہ میرے شیخ اور میرے جملہ معاصرین کے امام ہیں اور اسی طرق کار پر گامزن ہیں جو ہمارے اکابر کا خصوصی مسلک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف کو معارض روایات میں تطبیق اور مشکلات الحدیث میں دلپذیر توجیہ کی ایک امتیازی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ بلا مبالغہ آپ کی نظیر سے نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام خالی ہے۔

حضرت شیخ کا منصب جلیل اور امامت فی الحدیث کا جو میں دعویٰ کرتا ہوں اس کی صداقت آپ پر بھی اس طرح واضح ہوگی کہ ان کی ایک دلپذیر توجیہ سنئے۔

مجھ سے ہی حضرت الاستاذ نے ایک بار فرمایا کہ صلوٰۃ کسوف میں جو آنحضور ﷺ سے تعداد رکوع کے بارے میں متعدد روایات آ رہی ہیں۔ یہ آپ کی خصوصیت پر مبنی ہے، کیونکہ آپ نے صلوٰۃ کسوف پڑھنے کے بعد صحابہؓ سے خطاب فرمایا تھا صلوا احدث صلوۃ صلیتموھا من المکتوبۃ (تم نے جو فرض نماز ابھی تازہ پڑھی ہے یعنی فجر کی نماز، تو اسی کی طرح صلوٰۃ کسوف کو بھی پڑھو) جس سے واضح ہوا کہ آنحضور ﷺ عام امت کے لئے صلوٰۃ کسوف اور عام نمازوں کے رکوع میں کوئی فرق نہیں فرما رہے ہیں۔ میں نے اس پر عرض کیا کہ حضرت! شوافع تو جناب رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد کو صرف تعداد رکعت کی تشبیہ پر محمول کرتے ہیں، وہ اس کا تعلق وحدۃ رکوع سے نہیں کرتے۔ اس پر [illegible]

حضرات شوافع کی کوشش ایک صاف واضح حقیقت کو نظری بنانے کی جدوجہد ہے ۔ بھلا آپ سوچئے تو سہی کہ جب آنحضور ﷺ نے کسوف کی نماز متعدد رکوع کے ساتھ مجمع عظیم کو پڑھائی تو اس ارشاد کی پھر کیا ضرورت تھی اور جبکہ ارشاد فعل کے مقابلہ میں اہمیت رکھتا ہے اور سب مانتے ہیں کہ فعل میں خصوصیت کا امکان ہے اور قول میں اس طرح کا کوئی احتمال نہیں تو پھر آپ ﷺ کے قول وفعل پر کیوں نہیں ترجیح ہوگی اور معارض روایات جب اس توجیہ سے ایک دوسرے کے موافق بنتی ہیں تو پھر یہ پسندیدہ روش کیوں ترک کی جائے۔

حضرت استاذ کی اس وضاحت پر نہ صرف میں محظوظ ہوا بلکہ آپ کی خداداد صلاحیت کا مزید قائل ہونا پڑا۔

دیکھا آپ نے کہ اکابر دار العلوم کس منفرد صلاحیت اور موہبت الٰہی کے جامع ہیں۔

استاذ الجلیل ! میں نے آپ کے قیمتی لمحات مصروف کئے جس کے لئے میں معذرت طلب ہوں ۔ میں آپ کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں ، خود اپنی جانب سے اور اپنی جماعت کی جانب سے ۔

واللہ یحفظکم اینما کنتم وھو حسبی
و نعم الوکیل نعم المولی و نعم النصیر۔